شبیر

بیگواهیں رَھشون شبیر بلوچءِ بابتءَ نبشتہ بوتگیں نبشتانکءُ رپورٹ۔

نزآروک :بی این ایم لٹریری فورم

شبیر

بیگواہیں رَہشون شبیر بلوچ ءِ بابت ءَنبشتہ بوتگیں نبشتانک ءِ رپورٹ

کتاب ءِنام : شبیر
نزآروک : بی این ایم لٹریری فورم
سال : 2019
شنگکار : زرمبش پبلی کیشن
تندجاہ : https://zrumbesh.com/publication/

1۔ابتدائیہ : ڈاکٹر جلال بلوچ
2۔پیش لفظ : سہراب بلوچ
3۔انٹرویو سیما بلوچ : زرمبش لٹریری فورم

رپورٹس

4۔سیما بلوچ : بی بی سی

بلوچی مضامین

5۔سُر مگّیں ڈیھءِ یلّیں بَچ : استاد بابُل لطیف
6۔بیاتر ادیرانت رپتگ ئے چمانی چراگ : مہروان کمبر
7۔لکمیر تئ بچکند مدام گیر کا ینت : مہروان کمبر
8۔بس اے شبیر ات : داس بلوچ
9۔رژن ءِ تالان کنوکیں ھمبل شبیر جان : فقیر بلوچ
10۔مہروانیں لکمیر : مہر ساز

اردو مضامین

11۔لاپتہ شبیر کو واپس آنا چاہیے! : عزت بلوچ
12۔سیما بلوچ کے نام ایک کھلا خط : جلیلہ حیدر
13۔شبیر زندگی کا استعارہ : دل مراد بلوچ
14۔مثال عشق نہیں ملتی : ڈاکٹر جلال بلوچ
15۔درد اور تکالیف سے بھرا۔۔ : سہراب بلوچ
16۔اپنا شبیر بلوچ : ایوب اسرار
17۔شبیر جسے میں جانتا ہوں : قاضی داد محمد ریحان
18۔رخصت اف اوار اُن سنگت : چراگ بلوچ

19۔شبیر میرا استاد	:	داس بلوچ
20 ۔پھر بھی یہ گلہ ہے کہ ہم وفادار نہیں!	:	دوستین بلوچ
21۔ایک مخلص دوست	:	حمید بلوچ
22۔انقلابی راہیں	:	خالد بلوچ
23۔شبیر بلوچ اور ہماری ادھوری مسکراہٹیں	:	مہلب بلوچ
24۔انسانیت کے علمبردار شبیر بلوچ۔۔۔	:	محراب بلوچ
25۔طلبا تنظیم کے رہنما شبیر بلوچ۔۔۔	:	محسن بلوچ
26۔سیما مجھے معاف کرنا	:	سفر خان بلوچ
27۔آٹھ جون بلوچ مسنگ پرسنز ڈے	:	شوہاز بلوچ
28۔آؤ شبیر مکالمہ کرتے ہیں	:	توارش بلوچ
29۔کچھ پرانی یادیں	:	محمد یوسف بلوچ
30۔زندگی کی تلاش میں	:	ذاکر بلوچ

پریس کانفرنس و بیانات

31۔شبیر بلوچ مجرم ہے تو عدالتوں میں پیش کیا جائے۔	سیما بلوچ
32۔سماجی رشتوں کو نبھانے کے علاوہ بلوچ خواتین انقلابی عمل کا حصہ بن چکی ہیں۔	ماما قدیر بلوچ
33۔انسانی حقوق کے ادارے بھائی کے بازیابی میں کردار ادا کریں۔	سیما بلوچ
34۔انسان کو آزادی اور زندگی کے حق سے محروم رکھنا انسانی حقوق کی بدترین مثال ہے۔	سیما بلوچ

ابتدائیہ

نوجوان طبقہ کسی بھی قوم کا سرمایہ ہوتا ہے جن کی انتھک محنت اور قربانیوں کی بدولت سماجی اور قومی تحریکیں کامیابی سے منزل پہ پہنچ پاتے ہیں۔ تاریخ کے ہر دور میں نوجوانوں کا بڑا اہم کردار رہا ہے، وہ چاہے ہندستان کی آزادی کی تحریک میں بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کا کردار ہو یا اٹلی میں قوم پرستانہ سوچ کا فروغ سب نوجوانوں کی مرہون منت ہیں۔ اسی طرح بلوچ سماج میں بھی نوجوان طبقہ بلخصوص بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (BSO) کے کارکنان مسائل اور مشکلات میں گھیرنے کے باوجود قوم کو آزادی کی راہ پہ لانے میں بے مثال قربانیاں دی ہیں۔ وہ چاہے 70ء کی دہائی کی جدوجہد ہو جہاں اس تنظیم (BSO) نے اپنے قیام کے چھ (6) سات (7) سال بعد جب آزادی کی تحریک شروع ہوتی ہے تو اس کی نہ صرف حمایت بلکہ اس کے کارکنان عملی طور پہ میدانِ عمل کا رخ کرتے ہیں۔ اس عملی کردار کی بدولت بلوچ جہد آزادی کی تاریخ میں نوجوانوں کی تنظیم (BSO) نے ماضی میں بلوچ قوم کو شہید حمید بلوچ، شہید شفیع بلوچ، شہید مجید بلوچ، شہید اسلم بلوچ، شہید فدا جان بلوچ اور دیگر تاریخ ساز کردار دیے جنہوں نے اپنے عمل سے نہ صرف بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (BSO) کا نام زندہ رکھا بلکہ ان کے فکر اور فلسفے نے ہر موقع پہ قوم کے لیے رہنماء اصول مرتب کیے۔ اگر بیسوی صدی کی جدوجہد کو دیکھا جائے تو اسے اس نہج پہ پہنچانے میں بھی بلوچ طلباء تنظیم (BSO) کا ہی کردار رہا ہے جہاں اس تنظیم نے بلوچ نیشنل موومنٹ (BNM) کے بانی شہید غلام محمد بلوچ اور بلوچ قومی تحریک کے رہنماء ڈاکٹر اللہ نظر بلوچ، بلوچ نیشنل موومنٹ (BNM) کے موجودہ چیئرمین واجہ خلیل بلوچ، شہید ڈاکٹر منان بلوچ، واجہ رحیم ایڈوکیٹ، بانک کریمہ بلوچ اور بشیر زیب جیسے رہنماء عطاء کیے۔ ان کے علاوہ جبری طور پر لاپتہ کیے گئے رہنماؤں میں بلوچ طلباء تنظیم (BSO) کا سابق چیئرمین زاہد بلوچ، وائس چیئرمین ذاکر مجید، سابقہ سیکرٹری جنرل عزت بلوچ ایسے نام ہیں جنہوں نے اپنے نظریہ اور فکر کی بدولت بلوچ قومی جدوجہد کو تحریک کی شکل دینے میں کلیدی کردار ادا کیے۔ ان عظیم ہستیوں کے علاوہ بہت سارے رہنماء اور کارکنان آج بھی بخوبی اپنا کردار نبھا رہے ہیں جہاں ان کے کردار کی وجہ سے ہر آنے والے دن بلوچ قوم کے فرزند اس تسلسل کو نہ صرف آگے لے کے جا رہے ہیں بلکہ ان کے کارناموں کی وجہ سے تحریک میں جدت کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے۔ نوجوانوں کا یہ کردار بلوچ جدوجہد کے ساتھ روز اول سے جڑا ہوا ہے۔ جہاں عین جوانی میں میر عبدالعزیز کرد اور یوسف عزیز مگسی نے بلوچ جدوجہد کو پروان چڑھانے میں بیش بہا قربانیاں دی۔ یہ وہی تسلسل ہے جسے آج کا نوجوان زیادہ تندہی سے جانب منزل لے کے جا رہے ہیں۔ بلوچ قوم کی یہ قربانیاں جو بے مثل ہیں لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ جہد آزادی کے ان علمبرداروں کے ساتھ قوم نے انصاف کے تقاضے پورے نہیں کیے۔ ان کی مثال ہمیں ہر سو نظر آتا ہے جہاں ان عظیم ہستیوں کے کارناموں پہ لکھاریوں اور قوم کے دانشوروں نے انتہائی بخل سے کام لیا اور اگر کچھ کام ہوا بھی تو وہ ان ہستیوں کے کارناموں کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرسکتا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان عظیم ہستیوں کے کارناموں پہ لکھی گئی کتابیں لائبریریوں کی زینت بنتے پر افسوس کہ ان کرداروں میں سے کسی ایک کردار پہ بھی کوئی جامع کتاب دیکھنے کو نہیں ملتی جہاں کسی ایک لکھاری نے کوئی تحقیقی کام کیا ہو۔ یہ یقیناً بلوچ قوم کے لیے کسی المیے سے کم نہیں۔ البتہ چند ایک مضامین کو مرتب کر کے کتابی

شکل دینا جیسے شہید غلام محمد بلوچ کے حوالے سے کتاب کا اجراء ہوا، میرے خیال میں یہ ایک مثبت شروعات تھی اس کے بعد تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ کوئی محقق بن کے اس کردار کی وضاحت کے لیے مزید تحقیق کرتا۔ الغرض جتنا ہوا قوم نے اسی پہ اکتفاء کیا اور آج بھی ان میں سے چند کرداروں کی برسیوں یا ان اسیر رہنماؤں پہ جو زندان میں اذیت زدہ زندگی جو موت سے بدتر ہے، گزار رہے ہیں ان کی یاد میں بھی یہی رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ کتاب بھی جو مختلف مضامین کا مجموعہ ہے اسی سلسلے کی کھڑی ہے جس میں بلوچ طلباء تنظیم (BSO) کے سابق مرکزی سیکرٹری اطلاعات شبیر بلوچ کے کردار کے حوالے سے قوم کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے خیالات قلمبند کیے ہیں۔ 4 اکتوبر 2018 میں کو بلوچ طلباء تنظیم بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد (BSO) Azad نے شبیر بلوچ کی یاد میں ایک مہم کا آغاز کیا، جہاں ادیبوں نے شبیر بلوچ کے کردار کے حوالے مضامین رقم کیے۔ اس کتاب میں ان مضامین کے علاوہ چند ایک نظمیں جو شبیر بلوچ کی شان میں لکھی گئی ہیں ان کے علاوہ رپورٹس، بیانات اور انٹرویوز بھی شامل ہیں۔ انہیں مرتب کر کے کتابی شکل دینا میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں جہاں میں ایک عظیم مفکر، مدبر اور رہنماء پہ لکھی گئی تحریروں کو یکجا کر کے انہیں ایک کتاب میں محفوظ کر رہا ہوں۔ جو آنے والے دنوں میں محققین کے لیے تحقیق کے در کھولنے کے ساتھ اس پہ عمل کرنا قارئین کے لیے راہ نجات بھی ہوگا جہاں انہیں پڑھ کر انسان شبیر کی شبیہ بن سکتا ہے۔ بی ایس او کا یہ اقدام تاریخی اہمیت کا حامل ہے جس کی وجہ سے شبیر بلوچ کا فکر اور نظریہ ہر خاص و عام کے سامنے آیا ہے اور مزید تحقیق کے لیے راہ بھی ہموار ہوئی۔ بی ایس او کے دوستوں کے ساتھ دیگر تنظیموں اور جماعتوں کے دوستوں کو بھی چاہیے کہ وہ دیگر اسیروں اور شہیدوں کے حوالے سے ایسے مہمات کا نہ صرف آغاز بلکہ تحقیقی کام پہ زیادہ توجہ صرف کریں اور بلوچ قوم کے تاریخی کرداروں کے ساتھ بلوچستان اور بلوچوں کو دیگر درپیش مسائل پہ مفصل کام کریں تا کہ بلوچ قوم کی جدوجہد کی تاریخ مستند شکل میں محفوظ ہو۔ ماضی میں کمزوریاں رہی ہیں جیسے ہمیں گزشتہ ادوار میں چلنے والی تحریکوں کے حوالے سے دستاویزات میسر نہیں جس کی وجہ سے بہت سارے عظیم کرداروں کے کارناموں سے ہم انجان ہیں۔ آخر میں میں پھر یہ گزارش کرتا ہوں کہ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ان عظیم کرداروں پہ ایسے پروگراموں کے انعقاد کے ساتھ ان پہ تحقیق کر کے مکمل کتب تحریر کیے جائیں کیونکہ زندہ اقوام کا یہ شیوہ رہا ہے کہ انہوں نے اپنے عظیم کرداروں کو سمجھ کر، پرکھ کر یاد کیے زندگی کی راہوں کا انتخاب کیا ہے ہمارے لیے یہ اسی صورت ممکن ہے جب ہم اپنے قوم کے ایسے معماروں سے واقف ہوں جنہوں وقت کی کھایا پلٹ دی۔

ڈاکٹر جلال بلوچ

پیش لفظ

بلوچ نوجوانوں کی جدوجہد اور قربانیوں نے بلوچ قومی جدوجہد آزادی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے ایک ایسا کردار ادا کیا ہے جس کی نظیر بلوچ قومی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس سائنسی اور جدید طرز سیاست کی خاطر جس میں بلوچ قوم کی بقاء پنہاں ہے۔ اس کے لیے ان نوجوانوں نے بڑی کٹھن مسافت طے کی ہے۔ یہ یقیناً ایک ایسے سماج میں ایک انتہائی مشکل عمل ہے جو روایتی سماجی خول اوڑھے ہوئے ہو۔ یہ نوجوان اس روایتی حصار کو جو جدید دور میں کسی بھی قوم کے لیے اجتماعی موت کے مترادف ہوسکتی ہے توڑنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں۔ ایسے میں جہاں ایک جانب سماج میں موجود بعض عناصر قوم کو انہی روایتی زنجیروں میں مقید کرنا چاہتے ہیں اور دوسری جانب قابض ریاست جو کبھی یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ بلوچ قوم تعمیر و ترقی کی راہ پہ گامزن ہوں۔ ایسے میں ریاست کی بلوچ دشمنی کی سوچ پہ مبنی نظام سے پڑھے لکھے نوجوانوں کی بغاوت ایک شعوری عمل ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس راہ میں زندگی کی مادی لذتوں سے آشنائی ممکن نہیں پھر بھی انہوں نے ان راہوں کا انتخاب کیا جو قوم کو توقیر بخشنے کا بنیادی ذریعہ ہے۔ ان نوجوانوں کی اس شعوری سوچ نے گزشتہ پچاس (50) سالوں میں بلوچ سماجی نظام کے ساتھ بلوچ سیاسی ڈھانچے کو بھی اثر انداز کیا ہے۔ یہ کہنے میں میں حق بجانب ہوں کہ بلوچ قوم آج جس نہج پہ پہنچ چکا ہے جہاں دنیا آج بلوچ قوم اور بلوچ قومی تحریک سے آشناء ہوئی اس میں رہنماء کردار بلوچ نوجوانوں بلخصوص بلوچ طلباء تنظیم (BSO) کا رہا ہے۔ جہاں اس تنظیم کے کارکنان گزشتہ پانچ دہائیوں سے ریاستی اور روایتی سماجی نظام کے پیروکاروں کے مظالم خود پہ سہہ رہے ہیں لیکن ان کے پایہ استقلال میں کوئی کمی دیکھنے کو نہیں ملتی بلکہ دشمن جس شدت سے مظالم ڈھاتی رہی ہے یہ نوجوان اسی شدت سے قومی حقوق کی جدوجہد کو جانب منزل لیے رواں ہوئے ہیں اور آج تک یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ آج دنیا میں مختلف قوتیں اپنے نظریے کی پرچار اور پذیرائی کے لیے جدوجہد میں مگن ہیں، مگر چند ایسی تحریکیں جو عالمی طاقتوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو چکے ہیں جنکی کامیابی کے پیچھے موجود اداروں کا انتہائی مصمم کردار رہا ہے، ان میں بلوچ طلباء تنظیم (azadBSO) کا نام ایک منفرد مقام ہے۔ اکیسویں صدی جو ٹیکنالوجی کی صدی کہلاتی ہیں جس نے دنیا کو ایک گلوبل ولیج میں تبدیل کردیا ہے جہاں ٹیکنالوجی کا مثبت استعمال کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں قومی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرانے میں ہمیں اپنی صفوں میں جدید دور کے تقاضوں کے مطابق سیاسی ڈسکشن کو وسعت دینا ہوگا تاکہ موجودہ قیادت آنے والی چیلنجز کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ دوسری طرف قابض اپنی گھناونی سازشوں کے تحت بلوچ سیاسی کارکنوں کو پابند سلاسل رکھ کر یا انکو ماورائے عدالت قتل کرکے یا اجتماعی قبروں میں دفنا کر اپنے بھرپور طاقت کا مظاہرہ کررہی ہیں۔ ایسے پرآشوبی حالات میں سیاسی شعور سے لیس نوجوان ہی بلوچ قوم کی آزادی کے مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں اب ذمہ داری ہمارے سیاسی حلقوں کی بنتی ہے کہ ان حالات میں اپنے سیاسی کرداروں کو اپنے سماج اور دنیا میں متعارف کرنے میں کس طرح کامیاب ہونگے۔ جدید دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر بلوچ طلباء تنظیم نے سابق سیکرٹری اطلاعات شبیر بلوچ کی بازیابی کی تحریک اور شبیر بلوچ کے فکر سے دنیا کو آشناء کرانے کے لیے سوشل میڈیا کے ہتھیار کو بھرپور استعمال کیا۔ اسی سلسلے میں دوستوں اور تحریکی ساتھیوں

نے شبیر احمد کیفکر و مقصد سے سماج اور دنیا کو آشنائی دینے کے لیے اپنے خیالات قلمبند کیے۔ ان دوستوں اور ساتھیوں کی تحریرات کو اکھٹا کر کے ایک کتابی شکل دی جارہی ہیں جو ایک احسن اقدام ہے۔ لاپتہ شبیر بلوچ پر لکھے جانے والے تحریرات کو ایک کتابی شکل دینے میں ڈاکٹر جلال بلوچ کی کاوش قابل قدر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قومی تحریکات میں لٹریچر کا ایک اہم مقام ہوتا ہے جس سے کوئی ذی شعور فرد انکار نہیں کرسکتا۔ کیونکہ کسی بھی قوم کی راہ نجات میں اس کے ادیب اور دانشوروں کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے جہاں وہ اس قومی ورثے (تاریخ) کو محفوظ کرتے ہوئے قوم کے لیے زندگی کے اصول مرتب کرتے ہیں۔ مختصراً لٹریچر کو سمجھنا اور سمجھانا قومی تحریک میں ایک کلیدی کردار اور سیاسی پختگی کی علامت بن سکتی ہے۔ شبیر بلوچ پہ مرتب کردہ اس کتاب میں نہ صرف شبیر بلوچ کی سوچ، فکر اور نظریے کو پیش کیا گیا ہے بلکہ اس میں ایک بہن اور ایک شریک حیات کے کردار کو بھی واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح سماج کے قدیم و فرسودہ رسم و رواج کو پس پشت ڈال کر اور ہر مشکل کا دیدہ دلیری سے مقابلہ کر کے لاپتہ افراد کے کیس کو مقامی اور بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانے کی جدوجہد کررہی ہیں۔ بلوچ ماؤں اور بہنوں کے اس جذبے کو دیکھ کر میں یہ کہنے میں حق بجانب ہو کہ بلوچ قومی تحریک میں نوجوانوں کی شعوری قربانیاں رائیگاں نہیں جائیگی۔ مختصراً میں ان تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہو جنہوں نے اس کتاب کی نشر و اشاعت کی ذمہ داری لی اور اسکے ساتھ میں بلوچ قومی جماعتوں اور سیاسی تنظیموں اور قوم کے ادیبوں سے اپیل کرتا ہو کہ وہ بلوچ فرزندوں کے کردار کو آشکار کرانے کے لئے عملی اقدامات کریں جن کا عمل ان نوجوانوں کے کردار کی ضمانت ہیں تاکہ بلوچ قوم اپنی تاریخ سے آشناء ہونے کے ساتھ قوم کے ان کرداروں کو یاد کر کے انکے نقش قدم پر چل کر قومی تحریک آزادی کی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

سہراب بلوچ

چیئرمین بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد

انٹرویو

شبیر جان دنیا کا خوبصورت ترین بھائی ہے۔ سیما بلوچ

زرمبش لٹریری فورم کی جانب سے لاپتہ شبیر بلوچ کی ہمشیرہ سیماء بلوچ سے ایک خصوصی انٹرویو۔

سوال نمبر 1: شبیر کو کس حالت میں اور کہاں سے اٹھایا گیا۔؟

شبیر اپنے فیملی کے ساتھ گورکوپ گیا تھا وہ اپنے لوگوں سے ملنے اور وہاں شادی میں شرکت کے لئے گئے تھے، شبیر بلوچ کی رفیقہ حیات بھی ساتھ تھی لیکن وہ خوشیوں بھرا سفر ہمارے پورے خاندان کی زندگی کو جہنم بننے کا سبب بنا اُس دن کے بعد نہ ہم جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں۔ 14 اکتوبر 2016ء کو پاکستانی فورسز اور خفیہ اداروں نے وہاں آپریشن کیا۔ بڑی تعداد میں زمینی فوج اور دو ہیلی کاپٹروں نے اس آپریشن میں حصہ لیا۔ شبیر کے ساتھ چھبیس افراد کو اغواء کیا گیا دیگر افراد کو چند روز بعد رہا کر دیا گیا لیکن شبیر جان کی ابھی تک کوئی خبر نہیں۔

سوال نمبر 2: اس وقت شبیر کے ہمراہ کون کون ہمراہ تھے۔؟

شبیر کی ہمرائی میں اس کی اہلیہ اور دیگر رشتہ دار تھے۔

سوال نمبر 3: لاپتہ ہونے کی خبر کس تاریخ کو آپ لوگوں کو ملی؟

اس دن جب وہاں آپریشن ہوا اور چھاپہ پڑا تو اس روز وہاں موبائل سروس بند کر دیا گیا تھا اسی لیے ہمیں تیسرے روز اس واقع کی اطلاع ملی۔

سوال نمبر 4: آیا جبری گمشدگی کی ایف آئی آر (رپورٹ) درج کرائی گئی ہے؟

ایف آئی آر درج کرنے ہم تربت پولیس تھانہ گئے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ ہم آرمی اور دیگر اداروں کے خلاف رپورٹ درج نہیں کر سکتے۔ اس کے باوجود ہم نے دو تین مرتبہ یہ کوشش کی اس کے باوجود بھی ہمیں کوئی کامیابی نہیں ملی۔ بلوچستان ہائی کورٹ میں جب لاپتہ افراد کے کیس کی سماعت ہو رہی تھی تو ہم وہاں گئے انہوں نے ہمیں بتایا کہ جب تک ایف آئی آر درج نہیں ہوگی یہ کیس عدالت میں رجسٹرڈ نہیں ہوسکتی، انہوں (عدالت) نے کہا کہ آپ لوگ جائیں ہم وہاں کے پولیس عملہ سے بات کریں گے وہ رپورٹ درج کریں گے۔ ہم واپس تربت گئے لیکن پولیس کا موقف وہی تھا کہ ہم فورسز اور خفیہ اداروں کے خلاف رپورٹ درج نہیں کر سکتے۔ اس طرح آج تک شبیر کی ایف آئی آر درج نہ ہوسکی کیونکہ پولیس خوف کے مارے فوج اور خفیہ اداروں کے خلاف رپورٹ درج نہیں کرتے۔

سوال نمبر 5: خاندان والے کتنے عرصے سے شبیر بلوچ کی بازیابی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں؟

جس دن ہمیں شبیر کے لاپتہ ہونے کی اطلاع ملی اسی دن سے ہم جہد مسلسل کر رہے ہیں۔آج ہمیں دوسال ہوگئے ان دوسالوں میں ہم نے اس ریاست کے انصاف کے تمام اداروں کے دروازوں پہ دستک دی اور ساتھ میں انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کو خطوط ارسال کیے۔ پریس کلبوں کے سامنے مظاہرے، بھوک ہڑتالی کیمپ اور عید کے دن بھی ہم سندھی مسنگ پرسنز کے کیمپ گئے اپنی فریاد ریکارڈ کرائی اور شبیر بلوچ کی گمشدگی کی تفصیل بھی انہیں دی اور اپنی روئیداد بھی سنائی۔ان دوسالوں میں جہاں ایک گھر کا ذمہ دار لاپتہ ہے، ایک پڑھا لکھا نوجوان لاپتہ ہے۔ یہ دوسال ہم نے انتہائی تکلیف میں گزاری اس کا اظہار شاید لفظوں میں ممکن نہیں کیونکہ یہ احساس ان افراد کو بہتر طور پہ ہوسکتا ہے جو اس اذیت سے گزر رہے ہیں۔ ان دوسالوں میں ہم نے جدوجہد کی اور مزید بھی جدوجہد کرتے رہیں گے۔۔ہم انسانی حقوق کی تنظیموں اور مہذب اقوام سے یہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس جدوجہد میں ہمارا ساتھ دیں تاکہ شبیر بلوچ اور دیگر لاپتہ افراد کی بازیابی ممکن ہو اور ہم گھروں میں آرام اور سکون سے رہ سکیں۔

سوال نمبر 6: ریاستی عدالتوں میں کیس درج کرایا گیا ہے؟

تمام عدالتوں کے ہم نے چکر لگائیں اور کیس کے کاغذات ان کے سپرد کیے۔۔۔ہائی کورٹ سے لیکر انسانی حقوق کی تنظیموں، پاکستانی اور عالمی انسانی حقوق کی تنظیموں تک ہم نے کیس درج کرائی بی ایچ آر او اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کے پاس بھی ہمارا کیس درج ہے۔ پندرہ روز قبل انہوں نے اپنے کمپئین میں شبیر کی بازیابی کے لئے کوشش کی۔لیکن بلوچستان میں جتنے بھی سیاسی کارکنان لاپتہ کیے گئے ہیں ان کی بابت ریاستی ادارے یہ بات تسلیم کرنے کو ہی تیار نہیں کہ انہیں ہم نے جبری طور پر لاپتہ کیا ہے۔ پاکستان نے جو کمیشن بنایا ہے یہ تضاد پیدا کر رہا ہے کبھی کہتے ہیں کہ لاپتہ بلوچوں کی تعداد چھتیس ہے اور کبھی کچھ کہتے ہیں۔ پاکستان میں ریاستی ادارے ان مقدمات کو درج ہی نہیں کرنے دیتے ہیں تاکہ لاپتہ افراد کا معاملہ آگے نہ بڑھ پائے، اسی لیے ہم انسانی حقوق کی تنظیموں کا سہارا لے رہے ہیں۔

سوال نمبر 6: انسانی حقوق کی تنظیموں اور دیگر سیاسی اور سماجی تنظیموں کا شبیر کی بازیابی کے حوالے سے کردار کو آپ کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

شبیر کی بازیابی کے حوالے سے انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کے کردار سے ہم کسی حد تک مطمئن ہیں جہاں ایچ آر سی پی کے سرگرم کارکن اسد بٹ ہیں جنہوں نے ہر حوالے سے ہمارے ساتھ مدد و تعاون کیا ہے، وہ چاہے پریس کانفرنس کی صورت میں ہو، مسئلے کو اجاگر کرنے کے لیے وہ ہمارے ساتھ اظہار یکجہتی اور شبیر کی بازیابی کے لیے ہم قدم رہا ہے۔اسد بٹ کی حوصلہ افزائی نے ہمیں اس جدوجہد کے لیے مزید حوصلہ دیا۔ بیرونی دنیا یا عالمی تنظیمیں جو ہیں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے علاوہ یو این او کے ذمہ داران اپنی ذمہ داریوں سے روگردانی کر رہے ہیں اگر یہ ادارے اپنی ذمہ داریاں پوری کریں تو میں سمجھتی ہوں کہ بلوچستان کے ساتھ دنیا کے ہر اس حصے میں جہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں، جہاں لوگ جبری طور پر لاپتہ کیے جا رہے ہیں، تو یہ واقعات پیش نہیں آسکتے۔۔۔۔یو این کا جو منشور ہے وہ آج اس پر ثابت قدم نہیں ہیں اور اس پر عملدرآمد نہیں ہو رہا ہے۔اسی لیے ایسے حالات پیدا ہوگئے ہیں جہاں آئے روز انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں۔

اس دوران شبیر بی ایس او آزاد کا مرکزی سیکرٹری اطلاعات تھا اور بی ایس او شروع دن سے شبیر کی بازیابی کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ آج چونکہ حالات اس نہج پہ پہنچ چکی ہیں جہاں بلوچ سیاسی کارکنان خاص کر بی ایس او آزاد کے کارکنان کوئی احتجاج نہیں کر سکتے، حالانکہ زاہد بلوچ کی گمشدگی کے وقت بھی بی ایس او نے احتجاج کیا تھا لیکن آج حالات وہ نہیں رہے اور وہ احتجاج بھی نہیں کر سکتے اور میں بھی نہیں چاہتی کہ میں نے اپنے شبیر کو تو کھو دیا ہے اب شبیر کے بعد بی ایس او کے کسی اور نوجوان کو ہم کھو بیٹھیں۔۔۔۔ شبیر کی جبری طور پر گمشدگی کے بعد عزت بلوچ مرکزی سیکرٹری جنرل اور اس کے دیگر دوستوں کو ریاست نے جبری طور پر لاپتہ کر دیا ہے اور دوسری تنظیموں کی جانب سے کوئی حوصلہ افزاء کارکردگی سامنے نہیں آ رہا۔

سوال نمبر 7: جب کوئٹہ پہنچیں تو کیا توقع تھی کہ آپ لاپتہ افراد کے لواحقین کے لئے ایک تحریک کا سبب بنیں گی؟

سیما بلوچ؛ قطعاً توقع نہیں تھیں کیونکہ ہم کسی حوالے سے عوامی رویوں سے مطمئن نہیں تھے لیکن جب ہم کوئٹہ پہنچے تو ہم نے فیصلہ کیا کہ محض کیمپ میں چند بیٹھ کر واپس جانے کے بجائے عوام کے اندر جا کر انہیں اپنی اور دیگر لاپتہ افراد کے لواحقین کی درد سے آشنا کرنا پڑے گا اور ہم نے یہی کہا میں نے اپنی بھابی اور دوست زرینہ کو لے کر کوئٹہ میں عام لوگوں سے ملے، انہیں آگاہی دی، ہم نے ریلی نکالی، ہم نے سی ایم ہاؤس کے سامنے دھرنا دیا ہر قدم پر عوام ہمارے ساتھ رہی اور پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ سب لوگ ہماری درد میں شریک ہیں۔ شبیر میرا بھائی ہے مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گی کہ شبیر دنیا کا خوبصورت ترین بھائی ہے لیکن صرف میرا بھائی نہیں بلکہ وہ قوم کا بیٹا ہے اور شبیر کسی ذاتی غرض کے لئے درد نہیں سہہ رہا ہے ان کی زندگی قوم کے لئے وقف تھی تو ان کے لئے آواز اٹھانا قوم کا فرض ہے شبیر جان نے عوامی آگاہی کے لئے بہت کام کیا ہے ان دنوں جب شبیر میدان میں موجود تھا تو بڑی تعداد میں عوام اس کے ساتھ تھے لیکن شبیر کے جانے کے بعد ہم نے مختلف ذرائع سے شبیر کی گمشدگی کی اطلاع عوام تک پہنچائی تو عوامی ردعمل قدرے مایوسی کن رہی لیکن شبیر کی دوستی نے مجھے مایوس ہونے نہ دی بلکہ مجھے طاقت دی، زرینہ کو طاقت دی جب نومبر 2018 کو ہم کوئٹہ پہنچے تو وہی اکیلا ماما تھا کبھی کبھار کوئی ہمدردی کرنے آتا، مجموعی طور پر صورت حال حوصلہ افزاء نہیں تھا لیکن جب ہم نے ڈٹ کر احتجاج کا فیصلہ کیا تو عوامی ردعمل میری توقع سے کہیں زیادہ مختلف ثابت ہوئی لوگ جوق در جوق اؤ ہمارے ساتھ اظہار یکجہتی کرنے لگے ایک وقت ایسا آیا کہ کیمپ میں جگہ کم پڑنے لگی صرف بلوچ نہیں بلکہ دیگر اقوام کے لوگ بھی آنے لگے، انسانی حقوق کے کارکن آئے، طلبہ آئے، ہماری احتجاج کامیاب رہی کیونکہ لوگوں نے خوف کا سامنا کرنا سیکھا۔

سوال نمبر 8: شبیر کی جبری گمشدگی کا خاندان پہ کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں؟

خاندان کا ایک فرد یہ بیان کر سکتا ہے کہ ان دو سالوں میں خاندان کن اذیت اور تکالیف سے گزر چکی ہے۔ ماں، باپ، بہن، بھائی اور دیگر رشتہ دار جہاں ہر ایک کے اپنے احساسات ہیں۔ میں ایک بہن کی حیثیت سے یہ کہہ سکتی ہوں کہ تکالیف بہت زیادہ ہیں، وہ چاہے ذہنی ہوں یا جسمانی، ماں آج انہی حالات کی وجہ سے ڈپریشن کے مرض میں مبتلاء ہے۔ شبیر کی گمشدگی کے بعد والد صاحب کچھ عرصہ ہسپتال میں زیر علاج رہے

جہاں ان کا آپریشن بھی ہوا، بھائی علاقہ چھوڑ کے دبئی چلا گیا، بھائی کے علاوہ بھی خاندان کے دیگر افراد ذہنی کرب اور شدید پریشانی میں مبتلاء ہیں، سب اپنی اپنی زندگیوں کی حفاظت میں مارے مارے پھرتے ہیں اور انہی حالات میں وہ زندگی گزار رہے ہیں۔ایک اور بات کا میں اضافہ کرنا چاہتی ہیں ہوں کہ ہمارے خاندان سے صرف شبیر نہیں بلکہ اس سے پہلے سفر خان کو اٹھایا گیا، وہ بھی ہمارے خاندان کا ممبر ہے جو چار سے زائد عرصے سے لاپتہ ہیں، ان کی بازیابی کے لیے جدوجہد کرتے کرتے ان کی بیوی گنجل ایک دردناک عذاب سے گزری اور اپنے شوہر کے گمشدگی کا درد سہتے سہتے ذہنی توازن کھو بیٹھا اور بے بسی کے عالم میں ان کی موت واقع ہوگئی، تکالیف بہت زیادہ ہیں یہ یقیناً کرب کا دور ہے جسے بیان کرنا ممکن نہیں۔

ختم شد

رپورٹس

بھائی کی تلاش میں 600 کلومیٹر کا سفر اور بھوک ہڑتال

محمد کاظم

بی بی سی اردو ڈاٹ کام، کوئٹہ

سیما اور زرینہ بلوچ، چھ سو کلومیٹر دور آواران سے اس امید کے ساتھ کوئٹہ پہنچی ہیں کہ ان کی بات سنی جائے گی۔ جو بات وہ میڈیا اور اس کے توسط سے متعلقہ حکام تک پہنچانے کے لیے آئی ہیں وہ ایک طالب علم رہنما شبیر بلوچ کی بازیابی کی ہے۔ سیما اور زرینہ نے ایک چھوٹے سے بچے کے ہمراہ کوئٹہ میں جمعے کے روز سے ایک ہفتے کے لیے علامتی بھوک ہڑتال شروع کر رکھی ہے۔ سیما شبیر بلوچ کی بہن جبکہ زرینہ ان کی بیوی ہیں۔ انھوں نے یہ بھوک ہڑتال کوئٹہ پریس کلب کے باہر بلوچستان سے لاپتہ افراد کی بازیابی کے لیے قائم بھوک ہڑتالی کیمپ میں شروع کی ہے۔

شبیر بلوچ کی بہن نے بتایا کہ شبیر اور ان کی بیوی رشتہ داروں سے ملنے کے لیے ضلع کیچ گئے تھے۔ چار اکتوبر 2016 کو سکیورٹی فورسز نے ضلع کیچ کے علاقے گورکوپ میں آپریشن کیا جس کے دوران شبیر کو حراست لیا گیا۔ اپنی بات پہنچانے کے لیے وہ یہ بھوک ہڑتال آواران میں بھی کر سکتی تھیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ 'وہاں ہماری بات سننے والا کوئی نہیں، ہم کوئٹہ اس لیے آئے کہ کوئی ہماری فریاد سن لے۔' سیما نے بتایا کہ 'دو سال سے یہ معلوم نہیں کہ ہمارا بھائی کس حال میں ہے۔ یہ بات کوئی دردمند انسان ہی سمجھ سکتا ہے۔ یہ سوچ کر ہم اور ہمارے خاندان کے لوگ ہر روز مرتے ہیں۔'

انھوں نے بتایا کہ وہ بھائی کا مقدمہ درج کرانے کے لیے ضلع کیچ کے متعلقہ حکام کے پاس گئے لیکن وہاں کے تحصیلدار نے سیکورٹی فورسز کے خلاف مقدمہ درج نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ حکام نے بتایا کہ اگر وہ نامعلوم افراد کے خلاف مقدمہ درج کرائیں گے تو وہ یہ مقدمہ کر لیں گے لیکن سکیورٹی فورسز کے خلاف یہ مقدمہ درج نہیں کیا جا سکتا۔ شبیر بلوچ کی بیوی زرینہ بلوچ کا کہنا تھا کہ انھوں نے متعلقہ تحصیلدار کو بتایا کہ نامعلوم افراد کے خلاف ہم مقدمہ اس وقت درج کراتے جب ہمیں معلوم نہ ہوتا کہ انھیں کس نے اٹھایا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ 'تحصیلدار نے پوچھا گواہ کون ہے تو میں نے بتایا کہ گواہ میں ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے ان کو حراست میں لیا گیا۔' شبیر بلوچ کے رشتہ داروں نے بتایا کہ وہ شبیر بلوچ کی بازیابی کے لیے ہائیکورٹ اور دیگر اداروں کے پاس گئے لیکن انھیں انصاف نہیں ملا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر 'ہمارے بھائی کے خلاف کوئی الزام ہے تو ان کو عدالت میں پیش کیا جائے، اگر ان کے خلاف کوئی الزام نہیں تو ان کو چھوڑ دیا جائے۔' بلوچ ہیومن رائٹس آرگنائزیشن کی چیئرپرسن بی بی گل بلوچ بھی بھوک ہڑتالی کیمپ میں موجود تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہائیکورٹ کے علاوہ انہوں نے دیگر لاپتہ افراد کی طرح شبیر بلوچ کی بازیابی کے لیے حکومت کی جانب سے قائم کی جانے والی کمیشن سے رابطہ بھی کیا۔ انہوں نے بتایا کہ شبیر بلوچ کے رشتہ داروں کا الزام ہے کہ ان کو فرنٹیئر کور کے اہلکاروں نے حراست میں لیا تھا لیکن کمیشن کے سامنے ایف سی حکام نے اس سے انکار کیا۔ بی بی گل بلوچ کے مطابق حکومتی کمیشن نے شبیر بلوچ کی گمشدگی کا مقدمہ درج کرانے کے لیے محکمہ داخلہ حکومت بلوچستان کو ہدایت کی تھی، لیکن تمام کوششوں کے باوجود ابھی تک مقدمہ درج نہیں کیا گیا۔

بلوچی نبشتانک

سُرمگّیں ڈیھّ ءِ یَلّیں بَچ

استاد بابُل لطیف

سال ءُ سَن ، وھد ءُ موسُم بَدل بَنت بَلے یا تانی کنزی دائم چَہ چاھَڑیں زھیراں سَرّ یچ اِنت۔ من نزاناں کُجام شَکلّیں یا تاں وتئ نَد ءِ ساھگ ءَ نوشتہ بکن آں کہ زِندءِ بازیں وھد ءُ پاساں ھَوار بیگیں نِند ءُ نیاد، سُبکیں گالوار بہ بیت یا چَہ زانت ءُ زانگ ءَ سَرکیل ءُ نہنگّیں بالاد کہ مُدام بچکندگ ءَ اَت۔ من گوش آں اے یک اَنچیں کِسّہ یے کہ بہہ آسر نَہ بیت۔ بلوچی ءَ گوْش اَنت سال پِر گوْزنت بلے گال اُوشت اَنت۔ منا یات اِنت زِمستان ءِ سارتی، نودانی شَموریں شَنزگ ءُ گوریچ ءَ ماں بَستگ اَت۔ آدینگ ءِ سُھب اَت من گوں وتئ ھَیالانی سُبک رَواجیں کُمیت ءَ چومُدامیگیں وڑا کِساس نُوہ ءُ دَھ ءِ مْیان ءَ چَہ وتئ گِس ءَ دَرکپت آں ءُ دیم پَہ جَھلا دسنگت ساگر ءِ وتاک ءَ کہ مئے سنگتانی سُھبت ءُ مَجلس، سیاسی گپ ءُ تْرانانی بُنجل اَت۔ ھَمُک سُھب ءُ بیگاہ نیادانی پَتّر تالان اَت۔ من وھد ئے ماں ساگر ءِ وتاک ءَ سر بوت آں چاراں سنگت شوھاز ءِ ھَمبرائی ءَ لاگریں ورناھے گوں ساگر ءَ نِندوک اِنت۔ من سلام دات ءُ بَگل گیر بوت آں، چَہ سلام ءُ دْروت ءَ رَندگپ ءُ تْران، کندگ ءُ مَزاک کُرت بلے ساھتے ءِ گوْزگ ءَ پَد سنگت شوھاز ءَ گوْشت کہ مانوں شُمارا مُوکَل کن اِیں جمبراں بَستگ ءُ ھُئورئے مَہ کنت، ماجُنزیں وتئ نیمگ ءَ۔ من ءُ سنگت ساگر باز مِنت کُرت کہ شپی بہ جَل اِت گُڑاھمے لاگریں ورناہ ءَ پَہ بچکند گوْشت اگاں زند ءَ وپاکُت ءُ موہ دات شُمئے گِندوک ءَ اَلّم کایاں۔ سنگت ساگر ءَ ھَم پَہ بچکند پَسّو تَرینت ءُ گوْشت اللہ شُمارا بیار اِیت مئے گریبی دَردائم پَہ شُما ساڑی اِنت۔ وھد ئے سنگت دیم پَہ وتئ ھَند ءُ دْمگ ءَ راہ گیپت آں من ءُ ساگر دو پَہ دو نِشت ءُ وتئ ھَیالانی شَلّیں نیاد بُنگیج کُرت داں جَھل دیگر ءَ۔ ھمے وڑا جَمبر ءُ گوریچ ءِ وت ماں وت جَنگ ءُ مِڑ اَت داں جَمبر ءَ باج بُرت ءُ ھُئور بوت۔ ھَمُک دیماتَل ءُ شیپ آپ اِتاں، دھکان ءُ شریک گوں کوڈالاں دیم پَہ ڈگارانی آپینکی ءَ جُنزان اِتاں من ءُ ساگر گوں بُتلگّیں دْرین ءِ چارگ ءَ مُشکول اِتاں کہ مگرب ءِ بانگ بوت۔ من ھَم ساگر مُوکَل کُرت ءُ دیم پَہ وتئ گِسانی نیمگ ءَ رھادَگ بیت آں۔ ھمے وڑا وھد دیما گام جَنان اَت کہ من گوں وتئ ھَنکین ءِ سنگتانی ھَمبرائی ءَ پَہ دْمگ ءِ دیوان ءَ آواران ءَ شُت آں کہ مئے دیوان ماں دْمگ آرگنائیزر ءِ سرکماشی ءَ بُنگیج بوت ءُ دیوان ءِ ھاسیں مھمان بلوچ نیشنل موؤمنٹ ءِ مَزن کارگُشاد نمیرانیں واجہ ڈاکٹر منان بلوچ گوں اُستاد علی جان ءَ ساڑی اَت۔ چَہ دیوان ءِ سرگالانی سرا سُھل ءُ تْران ءَ پَد دْمگ ءِ گچینکاری بِندات بوت ءُ دیواں وتئ گُڈی آسر ءَ سر بوت۔ چَہ دیوان ءِ ھَلاسی ءَ پَد یکرندئے پَدا من گوں ھمے سوسنیں ورناہ ءَ ڈیک وارت کہ اے مْیان ءَ سال ئے پِر گوْستگ ء۔ بلئے اے رَندیگیں گِندگ ءَ پَد مئے گوں یکّے دومی ءَ شریں وڑئے ءَ پَجّاروکی بوت ءُ من سرپد بیت آں کہ اے لاگریں ورناہ ءِ نام شبیر بَلوچ اِنت۔ ھمے وڑا وھد ءِ بوجیگ ماں ساوڑیں تیاب ءَ چَتول جنگ ءَ اَت مئے گوں یکّے دومی ءَ گیشتر ھَوار ءُ یکجائی، نِند ءُ نیاد، جُہد ءِ آجوئی ءُ راجی جُنز ءِ دَرگت ءَ سُھل ءُ تْران، پُرکئیپیں دیوان بَرجاہ اَت۔ ھَمُک دیوان ءَ ما کہ دُوچار کپت اِیں شبیر جان بے گپ ءُ تْران نَہ اَت، اَلّم راجی جُنز ءِ سرا چمشانکے دات ءُ وتئ نُگرّھیں دانک پَمّا شکسات اَنت۔ دومی یک ءُ دووانگی اَلّم آئرا وتئ ھَمبرائی ءَ گون اَت، وانگی وت ونت ءُ دومی ءَ راھَم کَڈن کُرت کہ پِلان وانگی ونتگ، اگاں نہ ونتگ اَلّم بُوان ئے کہ راجکاری ءِ سرا

بْراھد ارنِبشتگ اِنت۔ چَہ شبیر جان ءِ اے مھّر چَکاریں دانکاں من مُدام ھمے مارت کہ کسّے ءَ اگاں گوں وتئ ماتیں گُلزمین ءِ مھّر اِنت تَہ آ اَلّم چو مَلنگ تب ءِ مھّر وانیں بنی آدم شبیر جان ءِ دْروشم ءَ بیت۔ چیا کہ شبیر جان تپتگیں گُلزمین ءِ پِریات ءَ سرپداَت کہ بیدئے سرڈگار ءِ آجوئی ءَ مئے آ کبت تامور ءُ زِندمان بے مَکسد اِنت۔ پمشکا اے لاگریں ورناہ مُدام پَہ راجی کارانی دیمرؤئی ءَ بَرئے ھَلک ءُ میتگے ءَ گولان اَت۔ منایات اِنت وھدئے واجہ زاھد چَہ شال ءَ اِستانی لشکریاں چِست کُرتگ ءَ گُڑا شبیر جان ءَ ھَمے گْوشت۔۔۔۔۔۔۔ پَہ راج ءُ کوم ءِ آجوئی ءِ کارانی دیمپانی ءَ گراں بھائیں زِندءِ بازیں سَر رؤنت بَلے!۔۔۔۔۔۔ گام دیما شھارگی اَنت ءُ جَلگّی نَہ اِنت۔ چیا کہ اُوشت مَرگ۔۔۔۔۔ ءُ دیمرؤئی زِندگی اِنت۔ اگاں کُجام راج گْوست ءَ چووانگی ءَ وانیت ءُ تْراوَلّیں پَندانی پُژدر ءَ چَندنیں واباں مانائے دَیگ لوٹ اِیت گُڑا آئی ءَ پَہ کُربانی ءِ دَیگ ءَ چَک ءُ پَد بُوگی نَہ اِنت۔ گُڑا من سَدکاں گوں شھیدانی مِھلّبیں ھُوناں رُوک کُرتگ ئیں کَندیل زُلم ءُ زُوراکی ءِ شَمالیں گْوات ءِ اَرجان نَہ بیت، بَلکیں یک زْرمبش ئے بیت ءُ دْژمن ءَ گار ءُ گُمسار کنت۔ بے دَروَریں ڈیھّ ءِ سرا راجدوستی ءِ مَزن شانیں بیرک مِک بیت، بیگواہ ءُ شھید بیتگیں پُسّگانی واب مانائے شکسائیت۔ چیا کہ بُو دِشتی اِیں ورناہ یک راجے ءِ شَھموک ءُ دْرپشنا کیں باندات گْوشگ بیت۔ اگاں مُبادا۔۔۔۔ !!!! ماوتی ڈُبّہ ءُ راجی ذِمّہ واری ءَ پُوہ ءُ سوھو نَہ بیتیں گُڑا پَہ جَزم بِزاں کہ ایر دَستی ءِ ھُون شَنزیں جُڑسر ءَ ساھیل اَنت۔ تو پَہ شَرپ گِدارے راجدْ پتر ءِ تاکدیماں کدی گِندَگ نَہ بَہ ئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مَروچی شبیر جان ءِ ھَمُک دُرّیں دانک گیر کائینت کہ چوکُران ءِ آیات ءَ دِل ءُ دِیدگاں نَکش اَنت، کَروجَگ نَہ بنت۔ پمشکاوش الھانیں واجہ نورھان ءُ نئیم پنجگوری ءِ گْوشگیں اے شئیریات آتک اَنت۔۔۔۔

یاتانی ماھکانیں شَپاں کہ پَدی کُتگ

تئ دوری ءَ گُشئے دِگہ ماھے وَدی کُتگ

دومی پِربند۔۔۔

شَپ کہ یاتانی مھپراں شاریت

تئ زھیر زِرد ءَ آس مانداریت

مَروچی تئ بیگوائی ءِ شبیر جان ھَمُک روچ گوں کرناں ھِساب بنت، بَلے۔۔۔۔!! اے گَپّ ءَ من سِتک آں لَسّھیں پِگرانی ھُدابُند ءُ رُژن ءِ پَد گِر کدی اَلباس نَہ بَنت۔ تو بہ گندئے سَرپد نَہ ئے۔۔۔۔۔۔۔! بَلے اے گَپّ ءَ مَروچی بلوچ ءِ زھگ، زھگ سَرپَد اِنت کہ تئ لاڑیں گھار سیماء بَلوچ گوں زرینہ ءِ ھَمبرائی ءَ پَہ تئ شُھاز ءَ چارراہ ءُ دَگانی پانگ اِنت۔ ھمے داب ءَ بلوچستان ءِ ھَرھَند ءُ دْمگ ءَ، ھرھَنکین ءُ میتگ ءَ دْژمنیں اِستان ءِ زُوراکیانی آس جَمبور اِنت کہ کسّے کماش ءُ بْرات، بَچّ ءُ جود، لوگبانُک ءُ جِنک بیگواہ اَنت۔ بلئے! بَہ کئول تئ شبیر جان۔۔۔۔۔ کئے سَرپد بہ کنت اے ناسرپد ءَ؟۔۔۔ کہ راجی جُنز ءُ آجوئی ءِ جُھد گوں کُشت ءُ کوش، گار ءُ بیگوائی ءَ اِیرموش نَہ بیت، بَلکیں گیش ءَ گیش مُھکم ءُ توانمند بیت۔

تئ زُلمانی چَکاس اِنت

ترانوں زِندگی ماس اِنت

"واجہ گوس بھار"

بیاترادیرانت رپتگ ئے چمانی چراگ

مہروان کمبر

مرچی پداتہناہی، مونجاہی ءُابیتکی دیم ءَمیلانک اَنت۔ دیم ءَچاراں لہتیں واب انت کہ پہ مانا کنگے ودار ءَانت ءُپشت ءَچک جناں کس نیست بس چندے بے مدتین ءُبیتاھیریں یات انت کہ بلکی گرنچے ءَبستگ انت پہ بوجگ ءِ ودار ءَانت۔ چیزے روچ انت بے جاڑی ءِ مولمانی تہایاں۔ لہتیں انچیں زھیر چکاریں ترانگ انت کہ منا نہ گوں آس ءَتران ءَ کلنت نہ وابیں دیدگانی گڈینگ ءِ موہ دینت۔ نی چوشیں ویرانگ چکاریں موسماں برے برے کہ ایوکی کساسے ءَچہ پرگوزیت گڑا گوست پررچان کنت ہمے گمان بیت مناں توے ماہیکانیں سرشپ ءِ تئی لہمیں کندگانی توارانت۔۔ من تومیتگ ءَچہ کمے گستازرباری نیمگے ہما کوہ ءِ جمپ ءِ سرانشتگ ایں واب کپتگیں بازارے ءِ بابت ءَجیڑگ ءَایں۔۔۔ گوریچانی نیمگ ءَجمبری کوکرے ءَسرکش اتگ گروگ جنگ ءَانت۔ کوش گوں شیگگ ءَبازار ءِ دمکاں کا گداں بال دیان انت۔۔ پدا گونڈوے ءِ گریوگانی توارکیت۔۔۔ پداماتے ءِ وتی بچ ءِ نازینگ ءِ توارہم کیت۔ لیلولیل منی بچیگ ءَ۔۔ بچیگ کہ رودیت ورنابیت۔۔۔ راج ءِ وتی پاسبان بیت۔۔۔ ماہ جمبرانی تہ ءَلیب ءَانت پداگروک ءِ شہم ءَگوں کرءُکش روڑ نہ بنت تو بچکندگ ءَبہ ئے من تراجُست ئے کن ں "زندگی" چی یے؟

توپسہ دَئے "بازکس گش ایت زندگی یک سمبہیتگیں واب یے کہ یک روچے شنگ ءُشانگ بیت بلے من گُش آں زندگی یک شوہازے گاریں چیزانی نوکیں رنگانی چم دیستگیں وابانی"

دگہ جُست یے مردم ءِ زندگیشترارزشت داریت یا آئی ءِ واب؟"

توابیتکیں بچکندے لُنٹاں تالان کن ئے ءُگشئے "واب"

پرچا کہ انسان وابانی پُشت ءَزندگ انت۔ ہمے واب انت انسان زندءَ سرگوزیت ءُمرگ ءَامباز کنت۔ انچو کہ نمیرانیں شہید سباء گُش ات

"واب باریں کُجا برانت زندءَ

گواہ کہ بیگواہ کننت وتی جندء"

کمّو ھاموشی ءَرند پداتراجُستے کناں

توچے گُشئے مامُرتگیں یا زندگیں؟

توگُشے "زندگیں"

من پداجُست کن آں ے گُلامیں زندءَ توچے پیم زندگیں انسان یے وتاراسرپد بہ ئے؟ کہ ہرچیز تی وس ءُواک ءَڈن اَنت؟ تی دل بازلوٹیت بلے تو گلامی ءِ سانکلاں انچو پیڑاتگ ئے انچو کہ مُردگے کپن ءِ تہاوش واب بہ بیت ءُبس کبرءُ کسارت کنگ بہ لوٹ ایت۔ تو سنگے زیرے زمین ءِ دلبند ءَ لکیر کشگ ءبندات کن ئے ءُگُش ئے انسان ہما وھد ءَمریت وھدے آئی ءِ واب مرانت۔ بلّے کہ مئے درستیں وشی مُرتگ انت، بلّے کہ مئے

واہشت ءُارمان مُرتگ انت بلے مئے واب زندگ انت۔ جمبر ءَنی چاریں دیم ءَمانشانتگ ءُدور ءَچہ بمب تراکانی توار بندات بیت ءُپدا یکشلہ رگبارے تیرانی توار ءَگوں کُچکانی وگ ہم بندات بیت۔ ءُ من کے ہاموشی ءَرندگہ جُست یے کن آں "واب چے پیم پیلو بنت"

تو گُشت کہ واب ہماوھد ءَپیلو بنت کہ وابانی ہمراہی ءسپر کن ئے ھمزہ رسول توپ ءِگشتن یے گُش ئے " کہ واب گندے گڑاوابانی پُشت ءَبہ تچ" ہمے تچ ءُتاک تراتی منزل ءَسر کنت۔ ہمے جُست ءُپسہانی پولگ ءَگوست پر گوزان بیت دیرتی کندگانی توارا یرمران بیت من چک جناں چاران تہ ایوکاں بس تہنا ہی ءِابیتکیں کُڈک اِنت مونجاہی انت ءُشپ انت چاراکتو برانت۔۔

"واب کا ینت نگاہانی دروازگ ءَ نورشان انت منی

تو کہ زندان ءَمارے وتی مہلبیں گلزمین ءِگماں

پُل گریونت ءُپاتو ہمے موسم ءَ

نودءِدُ عاءَ کن انت

دانکہ لکمیر تی واب روکیں چراگانی دیم ءَکپ انت "

لکمیر چاراکتو برتی بیگواہی ءِروچ انت۔ مروچی دوسال سرجم انت تی بیگواہی ءَ۔ اے دوری ءِدراج کش ایں ودار باریں چنچو دراج کش بیت نزاناں بلے منی ءُتی گڈی نیاد ءِبچکند گانی بہشتیں جاگہ ءِہماشپ ءِکسہ گون کندگ ءُٹھکاں انگت ہما سرمہ دانی ایں زمین ءِسراپش کپتگ۔

من کُجام شیر کنیں ساھتان بہ زراں کہ تئ گوست ءِگیرھچ وڑاکوہن نہ بنت۔ بیاپداہما دمکاں زندگی ءِواباں شوھازیں کہ اچ ترارندوھدے گباراں گپتگ ات آں۔ بیاترادیرانت منی رپتگیں چمانی چراگ۔ نوں تئ یاتانی پد منتگیں کشار رستگ ءُدان انت۔ اچ ترارند آدمک نوں بگندئے پیشی وڑا ھبرمہ کن انت پرچاکہ درستیں ندارگ بدل بیتگ انت۔ ہمانیادانی بہشتیں جاگہ درامداں وتی ہنکین کُتگ۔ ہما سنج دروشمیں ندارگ ویرانگ چکاریں موسمانی ارجان انت۔

لکمیر بے ترا اے زندءِ ہمک رہسر ابیتک ءُملورانت کشک تی انتزار ءَگریونت۔ نزاناں روچے چُنت برائے دیوال ءُدمکانی رنگ مٹ بنت۔ دگہ ھچ نہ منتگ بس پش کپتگ ایں بندیں درانت گوں اُمیتاں بندوک انت کہ تو واتر بہ ئے ءُتیلانک بہ دئے ءُپچ بکن ئے

لکمیر تئ بچکند مدام گیر کاینت

مہروان کمبر

زمین بس ہما مردماں وتی ھیال ءِ تہ ءَ پشت گیج ایت کہ آہاں وتی زمین ءِ سرا زندگ بوھگ ءِ واب دیستگ ۔ زندگی ءِ سپر ءَ باریں ماچھو مردماں گوں ڈیک وریں بلے درستیں مردمانی رنگ ءُ دروشم یات نہ بنت بلے اے زندگی ءِ سپر ءَ لہتیں انچیں مردم ہم ڈیک وارتگ کہ آہ پدا ھچبر شموشگ نہ بیتگ آں ۔ انی دیگرے وھد انت کمو دیراں پد دمکاں تہاری مانشانیت ءُ اے ساھت ءَ من وتی بے ڈسیں کوٹھی ءَ تہنا ہی ءَ نشتگ ءُ ھما سنگت گیر آھگ ءَ انت کہ آہ لکمیر نام ءَ زانگ بیت 1 اکتوبر 2016 گورکوپ ءَ زور گریں لشکرے دست ءَ آوار جنگ بیت انچو کہ مئے چمانی واب انت کہ شپ ءِ تہاری ءَ آوار جنگ بیتگ ات آں ۔ کسان سالیں لکمیر کہ مدام بچکند ے آئی ءِ لنڈانی براہ ات ء ُ کتابانی شیدائی ئے ات باندات لیڈرات . لکمیر ءَ ھوار دگہ ھزارانی کچ ءَ بلوچ نوجوان کہ بلوچ کوم ءِ چم ءُ پونز گشگ بیتگ انت ءُ باندا تگیں رہشون آہ قابض ریاست ءَ آوار جتگ انت زندان ءِ میار کتگ انت یا کہ شہید کتگ انت کارل مارکس گش ایت ایر دستیں چاگردے ءِ نشتگیں مھلوک ءِ واستہ پہ بابادیگ ءَ دگہ ھچ پشت نکپیت بیدے زندگی ءِ بابادیگ ءَ ءُ جہد کنگ ءَ ۔ لکمیر جان آواران ءِ مگ لباچ ءَ یک گلا میں لوگے ءَ ودی بیت وانگ ءِ ھاترا شال ءَ روت گڑا مہروانیں شال ءَ کوہ مردار ءِ کوہ ءَ روچ سرا کش ایت ءُ اسپیت ایں بر پانی سراوتی برانزاں دور دنت گڑا بر پانی رنگ گوں شہید مجید جان شہید الی جان کرد شہیدار پان ءِ ھونانی رنگ ءَ سہر بنت ءُ پدا ھزاراں بلوچ پسگانی ھون شال ءِ چکاریں دلبند ءَ چوبشی جمبر ءِ شل انت چلتن ءِ سبزیں دامن ءَ ھونانی شہکورے تچ ایت ہر دگ ءَ ہر دمک ءُ دراں ھونانی ھارے ملیت گڑا لکمیر جان ءِ بے تاھیری گیش بوھان بیت آہ وتی گلامی ءَ ماریت گوں بلوچ راجی تحریک ءَ ھمگر نچ بیت . بلوچ واندہ گل بی ایس او آزاد شال زون ءِ ممبرے بیت پدا واتر وتی ھلک ءَ کیت آوران زون ءِ زمہ دار بیت پدا آہ اعزازی سی سی ممبر زیرگ بیت ۔ 2015 سیشن ءَ انفارمیشن سیکٹری گچین کنگ بیت پدا مدام گوں کتابانی وانگ ءُ سنگتانی تربیت ءَ گوں دلگوش بیتگ ۔ من وتی ء ُ لکمیر جان ءِ سنگتی ءِ سپر ءِ ترانگ ءَ کپ آں کہ اولی رند ءَ زندگی ءَ مناء ُ لکمیر دچار گیتک دیگرے وھد ءَ چہ کموساری اپریل ءِ گڈی روچاں یک دنز ءُ مج ءُ تامورا بیتگیں بیگاہے ءَ من اولی رند ءَ دیست یک زیباہیں بچکند ے آئی لنڈاں تالاں بوت . ہمداچہ منی ءُ آئی سنگتی ءِ سپر منی پر پٹ ءِ پُشت ءَ کندگاں گوں بنگیج بوت . ہمداچے من زانت کہ زندگی سنگتی ءِ نام انت ء ُ مھرے نام انت ۔ من لکمیر مدام جست کت کہ زندگی چی اے؟ جواب دات ئے کہ زندگی پلے، وشبوے، جلوہے ءُ زندگی بچکند ءِ نام انت ء ُ جنز گے ءُ جہد کنگ ءِ نام انت ۔

پدا من ات آں ، لکمیر ات ، سنگت ات آں ، واب ات آں آ گہی ءَ دیستگیں واب ، وابانی مانا کنگ ءِ واستہ سپرات گران ء ُ مشکلیں سپر . ھے وابانی واستہ نمیرانیں شہید سباد شتیاری وتی نظم ءِ تہ ءَ گش ایت ۔

چچو واب آ گہی ءَ دیستگ من

گوں ھمے واباں زندگاں انگت

واب لوٹت ارساں ھون بکنت

گوں مرگ ءَ مڈاھے گوں بکن

من پمے ھاتر اوتا کشتگ

کنٹگ ءُ پلے زندءَ رودینتگ

زند مان دردے کہ وڈالیگ انت

راجے ءِ زندانی ءِ سوالیگ انت

واب باریں کجا برنت زندءَ

گواہ کہ بیگواہ کنت منی جندءَ

واب من آ گہی ءَ چاراں باں

کنٹگاں دیدگاں داراں باں

درداں من زندگی ءِ ماراں باں

درداست انت کہ زندگی است انت

واب است انت کی درد آ گہ بنت

من مہ باں بلے واب زندگ بنت

زندءَ جوریں جواب زندگ بنت

مھرے درستیں ھساب زندگ بنت

مہروانیں لکمیر تی آوار جنگ ءَ پد زندگی نی پیسری رنگ ءَ نہ انت گشئے زندگی مرچاں ایتکی ءِ سازانی کداماں پیڑ اتگ نی زندگی دردے ءُ زندگی جیڑ ھے۔ امینچو تی دوری ءِ ماہ سال گیش بوھان انت امینچو گیش تئ گپ, تئ بچکند, ءتئ داتگیں درستیں لیکچر گیر پیداک انت۔ تی سوگات کتگیں درستیں کتاب من دوبرونتگ انت بلے مھروان انگت گوں منا پہمگ نہ بنت نہ اُفتادگان خاک پہمگ بیت نہ کہ تعلیم اور مظلوم عوام۔ ماتم ایک عورت کا ءُسرگزشت اسیرءَ واناں تی ترانگ گیشتر کا ینت گڑاروان اسٹنگے الم وراں۔ ھما چوک ءِ سراداں دیراں اُوشتاں کپودرانی ندارگاں چاراں کہ من ءُ تو گڈی رندءَ یک دومی پدا ملگے گشت ءُ اجازت کت۔ دیریں ہیالے ءَ کپ آں پدا ھمیگماں بیت کہ زندگی وتی گوازینتگ ایں روچانی سراجیڈ گے نام

انت اودءَ منا۔توے۔۔۔سنگت انت۔۔۔سپر انت۔۔۔جالبار انت۔۔۔پر پٹ ءِتوار انت ءُ دیگر انت مُج ایرنندان انت پدا کندگے ءِتوار بیت زندگی مُجانی ایرنندگ ءِنام انت بلے تو مُجانی ایرنندگ ءَ ساری آوار جنگ بیت ئے ۔گوں گونڈیں بالادءَ کسانیں امرءَ یک انچیں کردے ءِ واہندات ئے مے وڑیں نابودءُ بے کردیں سنگتانی واستہ یک سکین ات ئے انچو کہ اویا بیدرجاھے گش ایت, نابودیں کارست دنیاءِ دڑاہیں کسمانکاں بہر زیرانت بلے انگت گیشیں (ایکسٹرا) بنت ، بلے بہ کول سنگتے ءِتو زندگی ءِ اسٹیج ءِ ھما کردار بیت ئے کہ دومی کردارے واستہ یک راہے گیش ایت۔پابلو نرودا گشیت ،اے سرگوست ءُیاتانی دپتر ءَادءَ اودءَ کہ لہتیں جاہ یل دیگ بوتگ انت برے برے اے شموشگ بنت پرچا کہ ھمیشی ءِنام زندگی انت۔بلے مہروان من گش آں تراچہ رندگہ ھچ نہ منگ اے جاور انت جاور بدل بنت بلے کوھنیں یات وتی رنگ ءَبدل نہ کن انت۔چوناہاں ما یک انچیں عہدے ءَزندگ انت ادءَلبز ھاموش انت ہر کس گنگ انت ادءَ توار چست کنوکیں انسان دوستانی زبان آوار جنگ بیتگاں بس گارء ءُبیگواہیں مردمانی عکس ءُ آہانی یات ءُ ترانگ گپ جن انت۔

بس اے شبیر اِت

داس بلوچ

بس شبیر اِت۔۔۔لباچ ڈنسرءِ درستیں ورناءَ چہ جدا اِت جدائیں تب ءِوُھند اِت گیش کندگ ءَاِت برے برے گپ نہ کُت ئے اگاں کُت ئے گُڑاکم گپ کُت ئے بلے وا وش گپ کُت ئے زانوگرءُ زانتکاریں ورناھے اِت مہروانے اِت دردمندے اِت بس زمین ءِ چُک ءِانت۔شبیر ،،گندے گوَاسگیں یاد زِندءِ مڈی اِنت ہچ بے ھال نہ بنت گوَسگیں یاد پدءَ زندگی ءَ زیبا کنگ ءِ گواہی ءَ دنت پداتئ وڑیں ورناہاں گوں زندگواز ینگ وت یک ازت ءُشر پداریں زندگی یے سکین ءَ دنت بلے گوسگیں یادانی سگگ گرانیں لھڑکن آں وپارکنگ ءِ نام ءَ نزان اَنت توت شرتر زانت کُت کن ئے کہ دردانی اوپاراں ھماں مردم کُت کنت کہ داردا ں گوں جنگ کنگ بہ زانت درداں نزور بہ کنت دردآئی ءِ کراساہءُکش ایت مہ کنت اے دردانی سھڑینگ ءَ یک پہمتگیں مردمے بزانت، پداتو سر پدے؟ کارانی گُشاد نیادانی براہ گُجام نیاد گُجام کارھما کار کہ زِندگی ءِ بہر اِنت ھما نیادانی براہ داریں ورنا عزت گوں نودوءُ چراگ کمبرءِ ہمراہی ءَ مرچی یازدہمی ماہ پورا اِنت چہ من چہ کستاءَ اِنت تو گُشت کن ئے کہ نیادانی براہ دار ساڑی مہ بیت ءُاے نیاد گُجام رنگ ءَ ڈول دار بنت تو زانے؟ تئ روھگ ءَ پدعزت ءَ وتی ٹویٹر آکاونٹ ءَ چے ٹویٹ کُتگ اِت ئے؟،،لکی تئ روگ ءَ پدکارانی سرءَ تجربہ کنگ گرانیں ءُمن نہ سرجماں،، بلے اے گپ عزت ءِوڑیں زانوگریں ورناءَ کُتگ اِت اگاں من بہ گش آں کہ نہ سرجم آں گڈا رد نہ باں پدامن مروچاں دگہ یک آدئے ءِ بنگیج کُتگ سک گِلہ کن آں توت زانت کُت کن ئے کہ گِلہ ہما مردم کُت کنت کہ ہچ کُت مہ کنت بس تہنا گِلا ہانی امبارے آئی ءِ کرابیت ادءَ من زانیں تراڈاکٹر حنیف شریف ءِاے گپ یاد کیت،،گلہ مکن کاربکن گلہ کنوکیں مردم مُدام پشت کپ انت،، ہما مردم کہ کارکم کن آں ءُگلہ گیش کن آں من ءَ ھما مُردمانی بنجاہ ءَ بہ بندر دنہ بئے تو۔۔چوناھا من وتی جاءَ رد اوں نیاں پرچہ کہ من تہنا تئ ودارءَ نیشتگ اِت انت دل ءَ اے واڈیں گواہی ہم ندات کہ اے ودارانی کسہ دراج بوھان کنت تئ ودار پدامن ءَ عزت ءِ ودارءَ پرمائیت بلے تو من ءَ ہزار رنداں اے گپ جنگ اِت کہ جنگ ءِ جند ناوشی ءِ نام اِنت ادءَ ہمراہ برگ بنت جنگ بنت صبرءُ برداشت ءِ وتی تہ ءَ ہاٹیگ ودی بکن من آہ وھداں تئ گپ دلگوش کُت بلے نہ پہم ات۔ اے ودار کنگ رنج ءُگم اے منی واست ءَ نادُرستیں لبز بوتگ اِنت توزان ئے؟ من گوں اے لبزاں کدی دُرستی بوتگ اوں؟ ھما روچاں کہ اے روچ ءَ تو برگ بوت ءِ دومی روچ ءَ حاصل قاضی شہید کنگ بوتگ بلے اے دردیگیں گپ یکیں ساھت ءَ من ءَ سر بوتگ اِنت پداءُ اے کسہ دراج بوتگ خمار ءِ کسہ سراج ءِ کسہ منور ءِ کسہ قومی ءِ کسہ دادءِ کسہ عزت ءُنودان چراگ ءُکمبرءِ کسہ بلے من ءَ نوں اگاں یکے جُست بکن کہ درد ءُرنج ءُگم ودار چی اِنت؟ من زان ئے چوں کن آں؟ من آئی ءِ کرا وتئ باتن ءِ تہے سرجمیں لہڑ بوتگیں درداں درشان کن آں نوں جی جی ءِ ہر گپ کندگ ءُمسکرا منی نزءَ گوں درداں بندوک اِنت بلئے جی جی ءُسلام اِنت کہ نوہ سال انت وتی اباءِ واست ءَ ودارانی گرنچے ءِ بستگ ءُ نشتگ ، شبیر،،،،،من چیچو بُہ گش آں کہ من چوناں بلے من سیماءُ مات پری وڑانیاں اگاں بُگش آں کہ ھما وڑاں من دروگ بند باں

رژن ءِ تالان کنوکیں ھمبل شبیر جان

فقیر بلوچ

من سک باز کوشست کُرتگ اَت کہ تئی بابت ءَ دولبز نبشتہ بکن آں چش کہ منی کد آ کد نہ اَت کہ من تئی بابت ءَ نبشتہ بکن آں بلے مرچی تئی ھما داتگیں سوج ءُپتاں تئی کِردءَ تئی مہراں مرچی منی وڑیں نابودے راپہ ندءَ چست کنگ ءَ دولبز ءِ نبشتہ ءَ کنگ لاچار کُرتگ من زاناں منی ند تئی کِردءِ بابت انساپ نہ کنت. پرچہ کہ تو ھما چراگ ءِ پَدگیری ءَ را کُرتگ ءُ ھما رژنائیں چراگ ءِ رژن مرچی تو ہریک گِدانے ءَ سر کُرتگ ھما گِدان بنی آدم تئی سر کُرتگیں رژن ءِ پدگری ءَ کنگ ءَ اَنت مرچی ہریک گِدانے ءِ اندرءَ چراگ روک اِنت یک گِدان دومی گِدان ءَ چہ رژن تالان کنان اِنت مرچی ھمے رژن دگنیاءِ کُنڈ ماں کُنڈ ءَ سر بوتگ ءُ سر بوگ ءَ اِنت مرچی دگنیا سر پد اِنت کہ یک دیارے اَست آبلوچستان ءِ نام ءَ زانگ بیت کہ آ دیاراے وھدی تھاری ءِ آماچ اِنت بلے آئی ءِ پر زنداں یک چراگے روک کُرتگ ءُ گوں وتی رِتلگیں ھوناں گلزمین ءِ دلبند ءَ چراگ زندگ داشتگ ھما چراگ ءِ رژن مرچی دگنیاءِ تہ ءَ وتی رژن ءَ تالان کنان اِنت ءُ مرچی ھما چراگ ءِ پہازگ ءَ ھزاراں پر زند سلاہ بند اِنت ھزاراں زندانی اِنت ھزاراں مردم گوں وتی ھوناں گون ھمے چراگ ءَ زندگ دارگ ءَ اِنت۔ پرچہ کہ ھمے چراگ ھمے پر زندانی زندءَ گوں بندوک اِنت ھمے چراگ ءِ رژن ھمے تہاریں دیار ءَ رژناہ کنت ءُ زندگ دار ایت۔ ھمے چراگ ءِ پدگیر کنوک ءُ رژن ءِ تالان کنوکاں چہ یکّے منی ھمبل منی رھشون شبیر جان ما دوستی ءَ پہ لکی جان گُشتگ لکّی جان یک سکیں وش روھیں سنگتے اَت مدام کندگ ءِ مسکرا کنگ ءَ اَت گوں وتی سنگتاں سک مھر وان ئے اَت تو کدی لکّی جان ءَ دیم تھاری ءَ نہ دیست مدام دیمے روشن اَت۔ منی گوں منی ھمبل لکّی جان ءَ اولی گِند ءُ نِند جولائی 2015 ءَ رمزان ءِ ماہ ءَ کیچ ءَ کوہ ءِ مراد ءِ سر ءَ بوت۔ ھمے وھد ءَ بی ایس او آزادءِ بنجائی ماٹو کُرتگیں باسک میرین ءُ ستار ءِ جیڑہ بِندات بوتگ اِت اَنت یکبرے پد ءَ بی ایس او آزادءِ پروشگ ءِ پُشت ءَ کپتگ اِت اَنت۔ یکّیں کیچ ھنکین اِناں بازیں ھنکین یے ھمے جیڑھ ءِ آماچ اَت بی ایس او ءِ آزادءِ بنجائی باسک ہریک ھنکین ءِ دوراہ کنگ ءَ اِت اَنت ھمے وڑ ءَ بنجائی باسکاں چہ لکّی جان کیچ ءَ مئے ھنکینی سنگتانی گوماملّگ ءَ اتک پرچا کہ مئے ھنکین ھم ھمے جیڑ ہانی آماچ اَت۔ تاں سئے روچ ءَ لکّی جان ھمد ءَ بوت گوں ہریک سنگتے ءَ گِند ءُ نِند ءِ کُرت ہریک جیڑہ ءُ جنجال ءِ بابت ءَ سر پدی یے دات ءُ کُل سنگت لکّی جان ءِ گپاں دلجم بوتاں ءُ تاں سئے روچ ءَ مارا لکّی جان ءِ کرّادیوان ءِ موہ رس اِت سک مزاک کندگ بوت کس ءَ نہ زانت باریں اے سئیں روچ ءُ شپ پہ چوں زوت ھتم بوتاں ءُ لکّی جان ءِ ھمراہی ءَ بیگوائیں اھسام جان ھم گون اَت ھما وھد ءَ اھسام جان کیچ ھنکین ءِ کارگشا دات سک وش اَت ھما وھد کہ ماکُل سنگت یکجا اَتاں۔ تاں لھتیں وھد ءَ چہ لکّی جان ءَ دور بوتاں ءُ یکبرے پد اماں 1 نومبر 2015 ءَ بی ایس او آزادءِ بیستمی بُنجاھی لس مجلس ءَ یکجاہ بوتاں اے بری لکّی جان ءَ گوں ھوار دگہ بازیں سنگتانی دیدار بوت۔ چما سنگتاں چہ شہید کندیل کازی، شہید سالا جان، شہید شاکر جان، بیگوائیں بی ایس آزادءِ مزن کارگُشا دثنا اللہ جان، بنجائی باسک چراگ جان، بنجائی باسک نودان جان ءُ دگہ بازیں سنگتے کہ مرچی زندان ءَ بند اَنت ءُ

دگہ بازیں سنگتے مرچی آشوبی سیاستِ میدانَ ءَ نشتگ ءُ آشوب ءِ دیم ءَ برگ ءَ اَنت اللہ آھاناں سلامت بہ کنت !! ماکُل سنگت یکجاہ اِت اَنت بُنجاھی لس مجلس ءِ دیوان اَت ءُ پدا اگاں کمو پارگ بوت ایں گُڑا شیئر ءُ شائری اَت مزاک ءُ کندگ اَت ھچ سر پد نہ بوتاں کہ اے سئیں روچ چون شُتاں اگاں شپ ءُ روچ گومن دارگ بوتین اِتاں گُڑا اَلّم من داشتگ ات آں کہ شُما ودارکن اِت کہ من انگت وتی ھمبلانی دیوان ءُ مزاکاں سیر نہ کُرتگ۔ ھمے نُنجاھی لس مجلس ءَ لکّی جان بی ایس او آزاد ءِ بُنجاھی شِنگکار زورگ بوت ءُ پدا ھر یک سنگتے وتی وتی ھنکیناں روان بوتاں ماھم وتی ھنکین ءَ راھی بوتاں۔ منی ھمراہ دگہ منی یک مہرونیں ھمبلے اَت سَپر سک وش اَت ماوتی ھنکین ءَ سر بوتاں ءُ لھتیں وھد ءَ پد یکبرے پدا گوں لکّی جان ءَ دیوان ءُ گپ بوت اے بری پدا ھم بیگواہیں نودان جان ھمراہ اَت مئے ھنکین ءِ دیوان ءَ اتکگ اِت اَنت۔ ھنکینی دیوان ءِ تہ ءَ گوں شرین وڑے ءَ گپ ءُ تِرّان بوت ءُ لکّی جان ءَ دیوان ءِ تہ ءَ تنظیمی امور ءُ آلمی ءُ دَمگی سیاسی جاور ھالانی سرا گوں شیریں وڑ ءَ گپ ءُ تِران ءِ کُرت گُوشت ئے اگاں مرچی ماوتی راج ءِ بزگی ءُ لاچاری نہ مار اِت گلامی ھلاپ ءَ جُھد نہ کُرت ھاس کر ما بلوچ نورد براں وتی پرز نہ زانت ءُ اے پد منتگیں راج ءَ را یک زندے دات کُرت نہ کُرت گُڑا باندائیں روچ ءَ نہ ما زندگ بُوت کن ایں نہ مئے راج ءُ نہ زبان پشت کپ اِیت مرچی ماراوھد اَست کہ ماوتارا زندگ بِکن ایں۔ ھنکین ءِ دیم ءِ کارانی واستہ یک نوکیں کابینہ ءِ ٹاھینت ئے ءُ دیوان ھلاس بوت پدا ما انفارمل دیوان کُرت مسکراءُ کندگ بوت آ روچ چہ بھشت ءَ کم نہ اَت پرچا کہ ماھمے وڑیں ھمبلانی گوما دیوان کنگ ءَ اِت ایں۔ ھمے وڑ ءَ وھد روان اَت ءُ گوں لکّی جان واے دگہ سنگتاں گِند ءُ نِند بوھان اَت سک باز سر پدی چہ سنگتاں رس اِت ءُ مدام بلوچ جُنز ءِ بابت ءَ گپ ءُ تران اَت مسکراءُ کندگ اَت ھمے وڑ ءَ وھد روان اَت۔ ستمبر 2016 ءِ ماہ ءَ یک روچے لکّی جان ءَ من ءَ ھال کُرت کہ شُمے ءُ اے دگہ ھنکینانی یک ورکشاپ دیوان ءِ بُوگی اِنت سی پیک ءُ شوشل میڈیا ءِ بابت ءَ وتی سنگتاں تیار بِکن ات من گُوشت شرکا مریڈ اَلّم ماھمے لوٹوکاں کہ اَنچیں دیوانے بہ بیت ھاھاھاھاھا اَلّم بیت پُل یکّے نہ باز بیت وت ءَ پریشان مَکن اِت مزنیں ٹھکّے جَت ءِ گُوشت ئے شر پُل گُڑا پدا ھال کناں کمو دگہ سنگت ھال کنگی اَنت۔ لھتیں روچ ءَ پد مئے ورکشاب دیوان بوت دیوان ءَ کراچی، ھب، اوتل، ملیر، گڈاپ، ھیدرآباد ھنکینانی سنگت دیوان ءَ ساڈی اِتاں . دیوان ءَ لکّی جان ءُ آدل جان ءَ ماراسی پیک ءُ شوشل میڈیا ءِ بابت ءَ لیکچر اِش دات کہ پاکستان ءَ سی پیک ءِ سرا گوں چین ءَ مئے جونانی سوداجَتگ مرچی پاکستان ءَ مئے مال ءُ مڈیاں ھوار مرچی مئے زِرھم بھا کُرتگ اگاں مرچی بلوچ راج ءَ سُد نہ کُرت ءُ ماوتی راج سر پد نہ کُرت وتی مال ءُ مڈیاں ھوار وتی زرءِ اپازت نہ کُرت گُڑاں ماچواے دگہ راجانی وڑ ءَ گار ءُ بیگواہ بنت انچوش کہ ھما راجاں وتی پرز نہ زانتگ ءُ زوراکاں ھما راج مرچی گار ءُ بیگواہ کُرتگ اَنت ماھم ھما راجاں چہ ھرید نہ بنت۔ سوشل میڈیا ءِ سر ءَ ھم سنگتاں گپ ءُ تران کُرت کہ پاکستان ءِ مرچی پرنٹ میڈیا بہ بیت یا الیکٹرونک میڈیا کُل پاکستان ءَ وتی دست ءَ کُرتگ اَنت ءُ بلوچ راج ءِ چُک چینی کنگ ءَ اَنت مارا دگہ راہ ءُ درنیست ابید چہ سوشل میڈیا ءَ اگاں ماراوتی توار دگنیا ءَ سر کنگی اِنت گُڑا مارا سوشل میڈیا پہ بلوچ ءِ ھک ءَ کار مرز کنگی اِنت نہ کہ یکّے دومی ءِ ھلاپ ءَ مرچی بلوچ راج ءِ سرا بوھوکیں پاکستان ءِ زُلم ءُ زورا کی مارا دگنیا ءِ کُنڈ ماں کُنڈ ءَ سر کنگی اِنت۔ ورکشاپ دیوان ءِ ھلاس بوگ ءَ پد ماکُل سنگتاں نان وارت ھمد ءَ چاہ اتک ما اکل سنگتاں یک ءُ یک کوپ چاہ زورت گُڑا لکّی جان ءَ منی دیم ءَ دگہ یک کوپے چاہے اِیر کُرت گُوشت ئے تو ھوٹل ءَ دو دو چاہ ور ئے مرچی ھم دو چاہ بور پکیر جان ھا اھاھاھاھا کُل سنگتانی کندگ

بُرز بوت لکّی جان ءِ گُوشت ھاں پکیر جان بارین تو ھما کِسہ ءَ بکن تو بازار ءَ دکان والا ءَ را چے گُوشت ھاھاھاھاھاھاھا لکی جان آ گپ ءَ بل ھاھاھاھاھا بُگش اش اگاں نہ گُڑا چاہ ءِ کوپ یکّے بیت ھاھاھاھاھاھا یکبرے پدا سنگتانی کندگ بُرز ءَ شُت . گُڑا من لاچار بوتاں ھما گپ ءَ بکناں پرچا کہ چائے کوپ ءِ واتر کنگ ءِ گران اَت پمن پرچکہ من مدام دو کوپ چاہ وارتگ ھاھاھاھاھاھا من ھما گپ گُوشت گُڑاں کس چاہ ءِ ورگی نہ بوت ھمے گپ ءِ سرا پرچا کہ انچیں مسکرائی گپے ات سنگتانی کندگ ءِ مسکرا بوت آ روچ سک وش اَت بلے اپسوس کہ گلامی ءَ وھد نہ دات لکّی جان روچے اے ھنکین ءُ روچے آ ھنکین ءَ ھمے بلوچ نودر برانی دیوان ءِ گند و نداں اَت مدام گوں گل ءِ کاراں دست گٹ اَت سکیں لاھکیں سنگتے اَت۔

دو اکتوبر 2016 ءِ روچ ءِ من ءَ پہ لکّی جان ءِ کارے ھستگ اَت من ھال کُرت کہ لکّی جان من ءِ کارے ھست تو منی ھمے کار ءِ بکن گوشی شر کمورندءَ ھال ءِ کُرت گُوشت ءِ تئی کار من کنا ھینت ءَ سنگتے تَرا ھال کنت بلے نوں من نیٹ ءَ در کپگ ءَ اَنت اگاں سلامت بوتاں ھال ءُ اھوال بیت۔ 6 اکتوبر ءِ روچ ءَ من وتی گِس ءَ نشتگ اَت آں سنگتے اتک گُوشت ءِ کہ من ءَ سنگتے ءَ ھال کرتگ کہ لکّی جان چہ کیچ گورکوپ ءَ پوج ءِ دست ءَ 4 اکتوبر ءِ بیگواہ کنگ بوتگ ءُ دومی ھال اِیش اِنت کہ کندیل جان ھم کولواہ ءَ شہید کنگ بوتگ۔ وھدئے من اے گپ اِیش کُرتاں من ھمد ءَ خُشک ءُ ھیران بوتاں۔ مرچی لکّی جان زندان ءَ بندیگ اِنت چہ وتی چاگرد ءَ وتی راج ءُ سنگتاں دور اِنت ھاں مرچی زندان ءَ دگہ ھزاراں بلوچ پرزند بندیگ اِنت بلے من زاناں کہ لکّی جان مرچی یک تھاریں کوٹی ئے تہ ءَ بندیگ اِنت چہ یکے دومی ءَ دور اَنت ءُ مرچی لکّی جان بندیگ اِنت . بلے لکّی جان ءِ ھما کاروان وتی منزل ءَ روان اِنت ھما پشت کپتگیں کاران مرچی لکّی جان ءِ سنگت دیم ءَ برگ ءَ اَنت ھاں ریاست ءِ لکّی جان ءَ زندان ءَ بندیگ کُرتگ بلے لکّی جان ءِ ھما رژن، پگر ءُ سوچ ئے بند کُرت نہ کُرتگ مرچی ھما رژن تالاں بوھان اِنت ھما رژن مرچی بلوچستان ءِ کُنڈ ماں کُنڈ ءَ سر بوتگ آئی پکر ودان انت۔

مہروانیں لکمیر

مہرساز

اے دنیاءِ تہا بنی آدم پہ مکسد زندگ بہ بیت جوانیں، بے مکسد یں زندگی ءَ چہ زندگ نہ بئیگ جوان تر انت، پرچہ کہ دگرے بابت ءَ جیڑگ بنی آدم ءِتہا چیریں ہما دروشم ءَ پدر کنت کہ آ ''انسانیت ءِ'' نام ءَ زانگ بیت۔ چُش کہ بلوچستان ءِتہا چُشیں ماتانی بچ باز اِنت کہ آہاں پہ دگرانی وشی ءِھاتر اوتی جان بکشا تگ انت یا چہ وتی آں سندگ ءُجتا کنگ بیتگ انت۔ ہمے پئیم ءَھمے ورناہاں یکے شبیر بلوچ (لکمیر) ہم استیں، لکمیر ھما ورناہاں یکے کہ آئی ءَوتی جندءَ چہ گیش وتی بزگیں راج ءُوتی ماتیں وتن ءَ گوں مہر بیتگ۔ وتی راج ءِباندات ءِوش کنگ ءِہاتر اوڑ وڑیں جُہد ئے کتگ۔ من اولی رندءِ لکمیر دیست آئی لنڑانی سرا نچکند تالان ات مناں ھمے گُمان بیت کہ سنگت سکیں مہروانیں مردمے بلے مار اوھدءَ موہندات کہ مادو بر لکمیر ءِ نچکند اں گوں اوار بہ کپ ایں۔ ۱۴ اکتوبر، ۲۰۱۶ ءِ لکمیر ھم ھما بندیگانی پئیم ءَ گار ءُ بیگواہ کنگ بیت بلے دژمن اے گپ ءَ بے ھال انت کہ من لکمیر ءِ پکر ءَ بندیگ کت نہ کناں۔ من مدام وھد ءِ وتی کمرہ چہ در کپاں گڑا کمرہ ءِ دیم ءَ جنگیں لکمیر ءِ عکس ءَ چاراں ءُ دیم پہ وتی منزل ءَ جُنزاں بلکیں اے عکس، تہنا عکسے نہ انت گشے لکمیر جندانت دیما انت ہمے گشگ انت کہ منی پکر ءُ سوچ ءَ زندگ دارت، وتی راج ءِباندات ءِ بابت ءَ بہ جیڑ ات۔

اُف لکمیر۔۔۔

تئی عکس ءِ گندگ ءَ پد من وتی تہا تئی پکر ءِ دیما برگ ءِ سوگند وراں، ھما جہد کہ تو کنگ ءِ بیتگ ءِ ھما جہد ءِ دیما برگ ءِ سوگند ءَ وراں اوا ے گپ ء ءَ من سدّ کاں کہ تئی پکر ء ءُ تئی سوچ دیما جنزیت ءُ وتی منزل ءَ سر بیت پرچہ کہ پکر ءُ سوچ کدی بندیگ کنگ نہ بیت۔

زوت آ جوبات ءِ مہروان

اردو مضامین

لاپتہ شبیر کو واپس آنا چاہیے!

عزت بلوچ

لاپتہ شبیر بلوچ جسے ہم 'لکّی' کہتے ہیں، نے ایک بار کہا تھا کہ میں اپنے ہی حق کے لیے کیوں مروں، حق بھی میرا اور زندگی بھی میری۔ میرا حق ہے، بغیر کسی مسئلے کے مجھے مل جائے۔ لکّی کی یہ بات سادہ تھی، لیکن سادہ باتوں کو کوئی کیوں کر سمجھنے کی کوشش کرے، خصوصاً وہ لوگ ایسی باتوں کو سمجھنے کے لیے کیوں خود کو پریشان کریں کہ جنہیں لوگوں کو لاپتا کرنے اور مارنے کا اختیار اُن کے بے مہار اختیار اور ہماری بے اختیاری نے دے دیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے حق کے لیے جان کی قربانی عبادت ہے، اس بات سے مفر نہیں کہ جان کی قربانی اپنے حق کے لیے عظیم ترین عمل ہے۔ لیکن اس عمل کو کر گزرنے کے لیے اپنے ایک بنیادی حق یعنی زندگی سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، زندگی سے دست برداری بذاتِ خود ایک خوب صورت عمل نہیں ہے۔ انسان سے اس کی زندگی چھیننے اور انسانی عزتِ نفس کو مجروح کرنے جیسا بدصورت عمل شاید ہی دنیا میں ممکن ہو۔ بلوچستان کی مٹی بھی عجیب ہے، نسلوں سے زیرِ عتاب ہے لیکن انصاف و برابری کی جدوجہد کرنے والے سپوت پیدا کرنے کا سلسلہ ابھی تک رکا نہیں ہے۔ بلوچستان میں ایک طبقہ ہمیشہ سے موجود رہا ہے، جس نے ظلم کے ضابطوں کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ اسکولوں میں ''تعلیم'' کے نام پر نوجوانوں کو بے علم کر کے گم راہ کرنے کے طوفانِ بدتمیزی کے باوجود بھی بلوچستان کے ایک بہت بڑے طبقے نے اس سے خود کو محفوظ کر رکھا ہے۔ میڈیا کی بے دلیل چیخ و پکار بھی ان اذہان کو منفی حوالے سے متاثر کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ذاتی زندگی میں مگن رہنے کو کامیابی کا نام دینے کی ''این جی اوئی'' سوچ بھی بلوچستان کی انقلابی تخم کو ابھرنے سے نہ روک سکی ہے۔ اداروں میں رائج سرکاری تعلیم کی بابت کسی دوست نے خوب کہا ہے کہ ''اگر کوئی دس سال مسلسل سرکاری اسکولوں میں سرکاری نصاب پڑھے، دوسری کتابوں کی جانب توجہ نہ دے تو اس کے انکار کرنے کی صلاحیتیں ناکارہ ہو جاتی ہیں۔'' لوچستان سے لاپتا ہونے والے بھی ایسے ہی لوگ ہیں جو مقتدر بیانیے کے برعکس سوچتے ہیں۔ کسی لاپتا شخص کا دوست ہونا کیسا بھیانک تجربہ ہے، یہ مجھ سمیت بلوچستان کے بیشتر نوجوان جانتے ہیں۔ کسی گم شدہ شخص کی بیٹی ہونا کتنا اذیت ناک تجربہ ہے، سمی، ہانی، مہلب سمیت بلوچستان کی ہزاروں بچیاں اس تلخ تجربے کی زندہ مثالیں ہیں۔ کسی لاپتا شخص کی، یا تشدد سے مرنے والے اور مسخ شدہ لاش کی شکل میں برآمد ہونے والے نوجوان کی ماں، باپ، بہن بھائی کے درد کا احساس الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتا۔ اب تک ایسا کوئی لفظ ایجاد نہیں ہوا ہے جو انسانی جذبات کو ویسے ہی بیان کرے، جیسا کہ وہ محسوس کر رہا ہے۔ شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ آنکھوں کی زبان الفاظ سے کہیں زیادہ پُراثر ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے، بلوچستان کی مائیں، بہنیں، بیٹیاں، باپ اور بدقسمت دوست ان تجربات سے بار بار گزر رہے ہیں، لیکن ابھی تک اغوا کا اختیار رکھنے والے اختیارداروں نے اس پالیسی کو روکنے کے بجائے جاری رکھا ہے۔ بات کسی اور کے لیے حیرانی کی بات ہو تو ہو، میرے لیے نہیں کہ بلوچستان کا ایک مخصوص مگر وسیع طبقہ ہی کیوں لاپتا ہونے کی، یا مسخ شدگی کی پالیسیوں کا شکار ہے۔ یہ طبقہ زندگی سے بھرپور ہے۔ کتابوں اور نئے خیالات کا متلاشی طبقہ، لوگوں سے جنوں

کی حد تک محبت اور عام لوگوں پر غیر متزلزل اعتماد کرنے والا طبقہ۔ اس قبیل کے لوگوں کی وجہ سے ہی ہم راو موساد کے ایجنٹ، بھٹکے ہوئے، مٹی بھر اور نہ جانے کیسے کیسے ''قابلِ فخر'' اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جسے ہر شخص کی پسماندگی، ناخواندگی، تنگ دستی انتہا کی حد تک ستاتی ہے۔ سر بازار جب کوئی بزرگ یا نوجوان کسی ''انسان نُما'' مسلح شخص کی جانب سے تلاشی کی ذلت آمیز عمل سے گزرے تو انہیں تکلیف سونے نہیں دیتی۔ اسکول کے بجائے جب یہ لوگ کسی بچے کو چائے والے کے پاس دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، یہ الگ بات کہ بچہ اسکول سے زیادہ روز مرہ کی تجربات سے زیادہ سیکھ سکتا ہے۔ لیکن اسکول جانے کی سکت نہ ہونا پسماندگی کی علامت ہے اور یہ لوگ ہر اُس علامت کو مٹانے کے لیے کوشاں ہیں جو انسان کی بے توقیری کرے۔ انسانی عظمت کی بلندی و آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے ان لوگوں کے لیے اب تک جو لفظ سب سے زیادہ مستعمل ہوا ہے، وہ غداری کا ہے۔ مقتدرہ طاقتیں اپنی میڈیا، تعلیم اور منبر کے ذریعے اپنی بنائی ہوئی اصطلاحوں کو زبان زدِ عام کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ لوگ جن پہ غداری کی چھاپ لگی ہوئی ہوتی ہے، اس بات کو کبھی بھی تسلیم نہیں کرتے کہ معاشرہ بے حس ہو سکتا ہے۔ ان کے خیال میں ایک مربوط سسٹم لوگوں کے ذہنوں کو سوچنے سے روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب نصابی کتب، میڈیا و اخبار انسانی احترام اور جذبوں کو پروان چڑھانے میں ناکام ہوں تو معاشرہ قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ تعلیمی نظام میں وہ جادو ہے کہ اس سے معاشروں میں بگاڑ و سدھار پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اگر ذہن تنقیدی و تخلیقی نہ ہوں تو اس کا نقص فرد میں تلاش کرنے کے بجائے فرد کی تربیت کرنے والے اداروں میں تلاش کیا جائے۔ چوں کہ یہاں اس نظام کو کنٹرول کرنے والوں کا مقصد انکار کی قوت کو ختم کرنا ہے، تخلیقی سوچ کا گلا گھونٹنا ہے۔ اس لیے وہ اپنے اس مقصد کی حصول میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ وگرنہ پاکستان کی معاشی ناہمواری اور لوگوں کی تنگ دستی کی انتہا کے باوجود یہاں غضب کی خاموشی نہیں چھا جاتی، بلکہ لوگ مر کر بھی اپنے لیے خوش حالی لانے کی جدوجہد سے دست بردار نہ ہوتے۔ دیو جیسی ریاستی مشینری، کاروباری فوج اور انسانی جانوں کی قیمت پر بننے والی ریاستی پالیسیوں کے خلاف بات کرنا سادہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کوئی واقعی تبدیلی چاہتی ہے تو کھلی آنکھوں سے بلوچستان کے شہروں و گلیوں پر نظر دوڑائے۔ بلوچستان کی ''پرشور خاموشی'' کو سننے کی کوشش کرے اور ریاستی بیانیے کے بجائے حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرے تو اس کو معلوم پڑ جاتا ہے کہ بلوچستان اپنے سپوتوں سے تبدیلی کی کیسی بھاری قیمت مانگ چکا ہے۔ چند دنوں پہلے اسلام آباد کے ''برگر انقلابیوں'' میں سے کسی کارکن کی ویڈیو سوشل میڈیا میں وائرل ہو گئی تھی، جس میں ایک معصوم کارکن کہہ رہے تھے کہ اگر پولیس ہم پر لاٹھی چارج کرے گی تو ہم کیسے انقلاب لا سکتے ہیں۔ موصوف دیکھنے سے کسی یونیورسٹی کے پڑھے لکھے لگتے تھے، لیکن حقائق کو دیکھنے و تسلیم کرنے کا اس کا پیمانہ کم از کم مجھے مضحکہ خیز لگا۔ اس لیے کہ سماجی تبدیلی جیسے عمل سے گزرنے کو ایک نوجوان کیسے اتنا سادہ سمجھ سکتا ہے، وہ بھی ایک ایسے ملک میں کہ جہاں ریاستی بیانیے کے برعکس بات کرنے والوں کے لیے قتل کے فتوے کھڑے کھڑے دیے جاتے ہیں، یہ ایک فطری بات ہے کہ جاگیرداری و سرمایہ داری کی اس جدید ترین ڈیزائن، جسے جمہوریت کے خوش نما لبادے میں اوڑھ کر تیسری دنیا کے عوام کو جس طرح کنٹرول میں رکھا گیا ہے، اس کے خلاف اُٹھنے والی ہر آواز جو سمجھوتہ کرنے کے بجائے اپنے مقصد پر ڈٹی رہے، اس طرح ہی غائب کر دی جاتی ہے جس طرح کہ بلوچستان کی آواز کو لاپتا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بلوچستان شاہد ہے کہ یہاں پانی مانگنے والی کم سن ازگل، اور بجلی مانگنے والا کمسن لطیف بھی بندوق کے ذریعے خاموش کیے گئے ہیں۔

تعلیم عام کرنے والے صبا اور عابد آسکانی بھی مار دیے جاتے ہیں۔ سیاست ہر کسی کا حق ہے کا نعرہ لگانے والے شبیر، زاہد، دین محمد، ذاکر، رمضان اور ہزاروں لاپتا ہو جاتے ہیں۔ ان ہزاروں لاپتا افراد میں سے ہزاروں کی بازیابی مسخ شدہ لاشوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ یہ سب تجربات ایک نسل کو ہی نہیں بلکہ کئی نسلوں کو یہ سکھانے کے لیے کافی ہیں کہ تبدیلی لانے کے لیے سخت جان ہونا پڑتا ہے۔ زندگی کی حفاظت کر کے جدوجہد کرنا پڑتا ہے اور زندگی سے دست برداری جیسے بدصورت عمل سے بھی مجبوراً گزرنا پڑتا ہے۔ لاپتا ہونے کا عذاب بھی سہنا پڑتا ہے۔ میرے لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا تلخ گھونٹ پینے سے بھی تلخ تر ہے کہ میرا اہم کار، میرا دوست شبیر بلوچ بھی اب ایک ''مسنگ پرسن'' ہے۔ بلوچستان میں ''مسنگ پرسن'' ہونے کا مطلب صرف لاپتا ہونا نہیں بلکہ ہر پل اس انتظار میں مرنا ہے کہ کب اس ''مسنگ پرسن'' کی لاش کسی ویرانے سے مل جائے۔ یہ باتیں خیالی یا تصوراتی نہیں، بلکہ مجھ سمیت بہت سے لوگ لاپتہ بچوں کے خاندانوں سے یہ سُن چکے ہیں کہ اگر ہمارے بچوں کو مارا جا چکا ہے تو ان کی لاشیں ہمیں پہنچائی جائیں۔ افسوس کہ احساس قلم بند نہیں ہوتے، اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات ہے کہ ایسی باتیں اپنوں کی طرف سے بھی اَن سُنی ہو جاتی ہیں۔ اگر لاپتہ لوگوں کی گم شدگی کا درد ایک اجتماعی درد ہوتا تو ہانی خود کو اپنے بابا کی ناکارہ بیٹی نہ کہتی۔ اور نہ ہی کوئی ماں اپنے بچے کی تصویر کو سینے سے لگائے بھرے بازاروں میں زور زور سے روتی۔ بلوچستان ہمیشہ سے شوریدہ رہا ہے، سیاسی کارکنوں کی بلوچستان میں جب شبیر، زاہد، ذاکر، واحد سمیت ہزاروں لاپتا؟ں کی گم شدگی پر بھی لکھاریوں، صحافیوں وادیبوں کی خاموشی نہ ٹوٹے تو کئی لوگوں کی امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ لاپتہ شبیر جیسے زندگی سے بھرپور نوجوان لیڈر کو، چیئرمین زاہد بلوچ کو، واحد، ڈاکٹر دین محمد، ذاکر مجید کو زندہ رہنا چاہیے۔ بلوچ لکھاری اور صحافی خاموش رہ کر اپنی ان ہستیوں کی زندگیوں کی حفاظت نہیں کر سکتے کہ ان کی زندگی سے ہی ہمارا قومی مستقبل جڑا ہے۔ گم شدہ لوگوں کے درد کو اب ایک اجتماعی درد بننا چاہیے۔ پنجابی، سندھی، پختون لکھاریوں کو بھی اس مسئلے کے خلاف مسلسل لکھنا اور بولنا چاہیے۔ بلوچستان کی سیاست کو زندہ اور برقرار رکھنا ہے تو سیاسی کارکنوں کی گم شدگی کے خلاف آواز بلند کرنا ہوگا۔ جبری گم شدگی ایک سیاسی نہیں بلکہ انسانی مسئلہ ہے، اس کے خلاف ہر شخص کو نظریات و سیاسی وابستگیوں سے آگے بڑھ کر دار ادا کرنا چاہیے۔

سیما بلوچ کے نام ایک کھلا خط

نومبر9, 2018

جلیلہ حیدر

میری پیاری بہن سیما بلوچ!

میں آج شاید کئی مہینوں بعد اپنے آپ کی رسائی اور نارسائی کی جنگ سے نکل کر یہ خط آپ کو لکھ رہی ہوں۔ آج جہاں آپ بیٹھی ہو اس جگہ ہزاروں بے جان روحوں کی آوازیں سسک سسک کر خاموش ہو چکی ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں اب صحافی سے زیادہ مخبر موجود ہوتے ہیں اور کوئی آواز جب اٹھنے کی کوشش میں ہو تو اس کا گلہ دبانے کے لیے سازشیں مرتب ہوتی ہیں۔ سیما میری بہن! ہم ایک سفاک عہد میں جی رہے ہیں، جہاں دو ارب انسانوں میں اور ریاست خداداد میں بسنے والی بائیس کروڑ آبادی میں آپ کو انسان ناپید ملے گا۔ آپ کے آنسو کیا ہیں، مجھ جیسے لوگ کیونکر اس پر سوچیں گے، کیونکہ مجھ جیسے فیمنسٹوں نے اب تو آپ ہی جیسوں کے نام پر امپاورمنٹ کے لیے، کیپسٹی بلڈنگ کا سیشن کرنے کے لیے ڈونر ایجنسیز سے نیٹ ورکنگ کرنی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جس چادر سے تم اپنے آنسو پونچھ رہی ہو، اس کا ڈیزائن مجھے پسند آئے اور میں کسی قومی کلچرا یگزی بیشن پر وہ نمائش کے لیے لگا دوں۔ میری بہن سیما، آنسوؤں کی نمائش نہیں ہو سکتی، دکھوں کی برانڈنگ مارکیٹ میں نہیں ہے، اس لیے تم اپنے ان آنسوؤں کے لئے کم از کم خریداران بازاروں میں ہرگز مت تلاشو، ہم دوسرے قسم کے فیمنسٹ ہیں کیونکہ تم ہمارے معیار کی عورت کی تعریف میں نہیں آتی، بقول شخصے "ہم تھوڑا سخت قسم کے لونڈے ہیں، ہم حساس اداروں پر حساس بات کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔" میری بہن سیما! دنیا کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ شبیر دو سال سے گمشدہ ہے۔ شبیر کون ہے، کسی کا اس سے کیا تعلق۔ وہ جو سعدی نے کہا تھا کہ "بنی آدم اعضائے یک دیگرند" کہ "آدم کے بچے ایک دوسرے کے اعضا ہیں" شاید کیسی خوابیدہ کیفیت میں بولا ہوگا۔ کھلی آنکھوں سے دیکھتا تو دنیا سے روپوش ہو کر کہیں جنگل میں بسیرا کرتا۔ میری بہن، جب تم ریاست سے سوال کرتی ہو نا کہ میرا بھائی جو کہ جبری گمشدہ ہے وہ کہاں پر ہے؟ تو بائیس کروڑ لوگوں کو یہ ایک خطرناک سوال لگتا ہے، کیونکہ ہمارے ہاں گمشدہ صرف اسی کو سمجھا جاتا ہے جب کوئی جرائم پیشہ کسی کو اٹھا کر لے جاتا ہے مگر کیونکہ ہمارے ادارے فرشتوں کے ادارے ہیں، وہاں پر کوئی گنہگار نہیں بستا، اس لیے جب تم کہتی ہو کہ میرے بھائی کو سن 2016 حساس ادارے اٹھا کر لے گئے ہیں تو یقین مانو سب سوچتے ہیں کہ یہ کہاں سے فنڈڈ خواتین ہر چھ مہینے بعد اس پریس کلب میں نمودار ہوتی ہیں، آنکھوں میں آنسو سجاتی ہیں اور پھر جھوٹ موٹ کا انصاف مانگتی ہیں۔

پیاری بہن سیما

تم جو سات دن اس کیمپ میں ماما قدیر اور حوران و بی بی گل وطیبہ کے ساتھ بیٹھی رہی، تمھیں پتہ ہے کہ جنگ جیتنے کے لیے لشکر کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ چند ہم خیال لوگوں کی ہی ضروت ہوتی ہے اور تمھارا لشکر مکمل ہے۔ جب تمھارے آنسو ایوانوں کو جھنجھوڑیں گے تو یقین مانو بہت سارے برانڈڈ کپڑوں میں ملبوس خواتین تمہارے ساتھ سیلفی لینے آئیں گی۔ وہ غور سے دیکھیں گی کہ تمھاری جیت یقینی ہے اور شبیر اب پلٹ کر آنے والا ہے تو یقین جانو سب اپنا فیس بک اسٹیٹس ہیش ٹیگ شبیر بلوچ سے چلائیں گے اور پھر تمھاری فتح کا جشن سب منائیں گے، وہ بھی منائیں گے جو کہتے ہوں گے کیمپ میں کیوں جائیں،

ن پیاری نہیں ہے کیا؟ مگر سیما جان، تم ان سب کو مسکرا کر خوش آمدید کہنا، کیونکہ یہی لمحے لٹمس کا کام کرتے ہیں اور سب کے رنگ آشکار کر دیتے ہیں۔
ری بہن، ہمت مت ہارنا، ڈٹی رہنا کیونکہ کوہ قاف سے دیو کی قید سے بچوں اور بچیوں کی آزادی کا ذمہ کسی دلیر چرواہے کے بیٹے نے ہی اٹھانا ہوتا ہے،
ں بار کیا پتہ دیو کی قید سے سارے بچے آواران و گوادر کی بہادر بیٹیاں آزاد کروائیں۔ میری بہن، دل کبھی چھوٹا مت کرنا کہ سیاسی جماعتیں تم سے یکجہتی
رنے نہیں آئیں، کیونکہ سچ تو یہی ہے کہ تمھارے آنسو اور اس گمشدہ جسم کے بغیر ان کے پاس سیاست کرنے کو بچا ہی کیا ہے۔ میری بہن یاد رکھنا،
قتور طبقوں کا کام مظلوم کے نام پر سیاست کرنا ہوتا ہے، مظلوم کے ساتھ سیاست قطعاً نہیں۔ میری بہن، حیران مت ہونا کہ صحافی حضرات خبر نہیں
ا پتے، یہ والا کام بھی اب سرکاری ادارے والے خود کرتے ہیں اور اس لیے پریس کلب میں صحافی سے زیادہ مخبر پائے جاتے ہیں اور اس کی سب سے
ی بات یہ ہے کہ سرکار ان کی کے خبریں ضرور دیکھتی ہے بجائے اخبار پڑھنے کے۔ میری بہن، یاد رکھنا میں دعویٰ نہیں کرتی اگر اس دنیا میں کوئی بھی شخص
ہاری حمایت میں آخری رہ جائے تو اس قطار میں مجھے ضرور تلاشنا۔ میری بہن، جام کمال سے جب ملو تو گلہ مت کرنا کہ ان کے پاس آپ سے ملنے کا
ت کیوں نہیں تھا کیونکہ جام صاحب مجبور ہے اور ہمیں مجبور لوگوں سے ہمدردی سے ملنا چاہیے۔ میری بہن، جس دن جام صاحب کو اجازت ملے گی وہ
پ سے ملیں گے اور ضرور ملیں گے۔ میری بہن، میں بہت بورنگ خط لکھ رہی ہوں، جس میں نہ محبت کی شاعری ہے نہ قصیدہ گوئی۔ بس دل میں سوچ رہی
ں کہ تم بھی ایک بار جاوید اختر کی یہ نظم ضرور پڑھو اور اپنے اردگرد بسنے والے قلم کاروں، سیاست داروں، تجزیہ نگاروں، نسوانیوں اور دکانداروں کا اسی
ے تجزیہ کر کے ہلکا سا مسکرا کر آگے بڑھتی رہو۔ جیت تمہاری ہی ہوگی۔

شہر کے دکاں دار و کاروبارِ الفت میں سود کیا زیاں کیا ہے، تم نہ جان پاؤ گے
دل کے دام کتنے ہیں خواب کتنے مہنگے ہیں اور نقدِ جاں کیا ہے، تم نہ جان پاؤ گے
کوئی کیسے ملتا ہے پھول کیسے کھلتا ہے آنکھ کیسے جھکتی ہے سانس کیسے رکتی ہے
کیسے رہ نکلتی ہے کیسے بات چلتی ہے شوق کی زباں کیا ہے، تم نہ جان پاؤ گے
وصل کا سکوں کیا ہے، ہجر کا جنوں کیا ہے حسن کا فسوں کیا ہے عشق کا دروں کیا ہے
تم مریضِ دانائی مصلحت کے شیدائی راہِ گمرہاں کیا ہے، تم نہ جان پاؤ گے
زخم کیسے پھلتے ہیں داغ کیسے جلتے ہیں درد کیسے ہوتا ہے کوئی کیسے روتا ہے
اشک کیا ہے نالے کیا دشت کیا ہے چھالے کیا آہ کیا فغاں کیا ہے، تم نہ جان پاؤ گے
نامراد دل کیسے صبح و شام کرتے ہیں کیسے زندہ رہتے ہیں اور کیسے مرتے ہیں
تم کو کب نظر آئی غم زدوں کی تنہائی زیست بے اماں کیا ہے . تم نہ جان پاؤ گے
جانتا ہوں میں تم کو ذوق شاعری بھی ہے شخصیت سجانے میں اک یہ ماہری بھی ہے
پھر بھی حرف چنتے ہو صرف لفظ سنتے ہو ان کے درمیاں کیا ہے، تم نہ جان پاؤ گے

فقط،

تمہاری ایک بے بس ہمدرد بہن

شبیر زندگی کا استعارہ

دل مراد بلوچ

انفارمیشن سیکریٹری بلوچ نیشنل موومنٹ

میں سمجھتا ہوں کہ شبیر زندگی اور روشنی کا استعارہ ہے لیکن یہ سمجھانا بے حد کٹھن ہے کہ کیسے سمجھایا جائے کہ شبیر کس طرح زندگی اور روشنی کا استعارہ بن چکا ہے؟ اس کے علامات کیا ہیں یا یہ کیونکر سمجھا جا سکتا ہے کہ شبیر روشنی اور زندگی کا استعارہ ہے میرے خیال کوئی یہ پوچھے تو اسے بتا دو کہ شبیر خوشبو کی طرح پھیل چکا ہے، ہماری سانسوں میں رواں ہے ہم اس کا مہک محسوس کر سکتے ہیں اور غلامی کے گھٹا ٹوپ اندھیر تاؤں میں بھی اس کے ذریعے حال کو دیکھ سکتے ہیں، مستقبل میں جھانک کر اس کے نظاروں سے محظوظ ہو سکتے ہیں بس جمالی حس کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی پوچھے کہ ہم نے اس خوشبو کو آج کل کہاں چھپا رکھا ہے، چاہنے والے دیدار کے لئے بے تاب رہے ہیں، رستہ کھو چکے ہم لوگ اپنے اپنے راستوں کو شبیر کا کھوج لگانا چاہتے ہیں تو بتا دو کہ ''شبیر زندگی اور روشنی کا استعارہ خوشبو کی ایسی کیفیت کی طرح ہے، جس سے شاید عطار بھی اچھی طرح واقف نہیں تھا کہ قدرت نے اپنی قوتِ کاملہ سے کیسی نعمت سے نوازا ہے، کیسی عظیم نعمت سے نوازا ہے، ورنہ وہ اسے یوں سرعام نہیں سجاتا، ہر بزم، ہر محفل کی زینت نہیں بناتا بلکہ اس خوشبو کے چاہنے والوں کو ان کی اسرار اور اشتیاق دیکھ کر ہی اسے دکھایا جاتا، سونگھایا جاتا، مگر کیا کیجئے کہ کیفیت جب تک طاری رہتا ہے ہم اس کی لذتوں میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ یہ فکر نہیں رہتا کہ کب ٹوٹے اور ہمارے ساتھ نہ رہے، شبیر کی صورت میں بکھرے زندگی اور روشنی کا استعارہ اور خوشبو کی کیفیت ہمارے ساتھ یہی کر گئی بلکہ دو دو ہاتھ کر گئی جب تک ہم کیفیت میں تھے تو انجانی، پُر لطف، پُر لذت پُر کیف سرور میں تھے جب کیفیت ہی ٹوٹا تو ہاتھ مَل رہے ہیں، اب کیا ہو سکتا ہے بس ایک افسوس کی چتا ہے جس میں ہمارے اَرمان جل رہے ہیں، ہمارے آرزو جل رہے ہیں، مستقبل کے سارے خواب جل رہے ہیں، اب وہ 'براق' کہاں سے لائیں جو کئی ہزار نوری سال مسافت پر ظلمت کی پاتالوں میں بند ہمارے اُس خوشبو کو واپس لائے، ہم ایک بار پھر اُس کی کیفیت میں کھو جائیں۔ اُس سے جینے کا ہنر سیکھیں۔۔۔ اس سے مسرت اور سرور پائیں۔''

کوئی پوچھے کہ شبیر آج کل کیسا ہے تو بتا دو

''شبیر خوشبو سے مہکی زندگی کے وادی میں تیرگیوں کے خلاف برسر پیکار ہے۔۔۔ تیرگی کے خلاف لڑتے لڑتے سراپا درد میں ڈھل چکا ہے اور آج کے بلوچستان میں بکھرے درد کے سلسلے میں ایک نئی درد کا اضافہ مگر یہ ایک ایسی درد ہے جس سے آشنا وہی ہوتے ہیں جو درد کے سفر میں عقل نامی شئے کو گھر کے کھونٹے میں باندھ دل کے تخت روان پہ سوار ہو کر تیرگی کے خلاف لڑنے زندگی کے وادی میں اُتر جاتے ہیں اور زندگی کے، روشنی کے دشمنوں سے لڑتے ہیں، تیرگی سے لڑتے ہیں، تیرگی پہ فتح پاتے ہیں، زندگی کی وقار کو بلند کرتے ہیں، زندگی کو زندہ ہونے کا احساس دلاتے ہیں وہی

احساس جو زندگی غلامی کے تیرگیوں میں کھو چکا ہے وہی احساس جسے زندگی سے شیطانی قوتوں نے دھوکے،فریب سے،کھلواڑ سے چھین لیا ہے،اورزندگی بھی اس احساس سے عاری ہو چکا ہے کہ ''وہ زندگی ہے،اسے بھرپورروشن ہونا چاہئے،اسے تیرگی کے پاتالوں سے نکل کر روشن راہوں میں خوشی کے پھول کھلاتے،مسکان کی پھلکاریاں بکھیرتے،نئی امنگوں،نئی آرزوؤں کوجنم دے دے کردرد کے باہوں میں باہیں ملاکرزندہ اورمنور ہونے کا ثبوت دیناچاہئے'' کوئی پوچھے کہ شبیرزندگی اورروشنی کا استعارہ کیسے بن گیا تو بتادو کہ ''شبیر بھی زندگی کوزندگی سے بھرپور بنانے کے لئے عقل نامی کوآواران کے کسی کونے میں کدرے میں پابہ زنجیر کرکے دل کے تخت رواں پرسوار ہوکرزندگی کوتاریکی سے چھڑانے کے لئے اُس وادی میں اترچکا تھاجہاں زندگی کو روشنی سے محروم کرکے تاریکی نے یرغمال بنالیا ہے۔۔۔مگراس غرض کے لئے بہتوں کے برعکس شبیر میں کوئی پیچیدگی نہیں۔کوئی لگی لپٹی نہیں بس سیدھے دلوں کودلوں سے ملارہا تھا گویا پیدا ہی اس مقصد کے لئے ہوا تھا کہ دلوں کودلوں سے جوڑے،کعبہ دل میں یزیدوں کے جمائے جمے زنگوں کو،دشت محبت میں نفرت کے گھوڑوں کے اڑائی دھول کو،وقت کے پیچیدگیوں سے پیدا کدورتوں کوایک مسکان سے ہمیشہ کے لئے مٹادے،شیشہ دل کواس طرح صاف کردے کہ جونظراٹھے توانسان کواپنے سراپے سے اُنس ہوجائے جونظراُٹھے توزندگی مسکراتا ہوا دکھائی دے اورانسان اپنے انسان ہونے پرندامت کے بجائے فخر سے سرشارہو۔'' کوئی پوچھے کہ ان کا فلسفہ زندگی کیا ہے توبتادو کہ ''شبیر کازندگی سے پیارکرنے کا فلسفہ بھی خوب ہے ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ ''زندگی آزادہوتو زندگی کہلاتا ہے غلامی میں زندگی ایک بوجھ ہے جسے لوگ ڈھوتے رہتے ہیں لوگوں کوزندگی نامی بوجھ اٹھانے کے لئے ہی سانس لینے کے لئے زندہ رہنے دیا جاتا ہے ورنہ اُن کا چنداں ضرورت نہیں'' اپنے فلسفے پراس طرح سودل وجان سے عمل پیرا کہ ایسوں کودیکھ کرہی لوگوں کویقین ہوتا ہے کہ واقعی اب کے زندگی بھرپور ہوجائے گا،صدیوں سے سسکتی زندگی اب آزادفضاؤں میں سانس کی قابل بن جائے گا،جنم جنم کے محروم،مایوسی کوودا ع کرکے امید کا جامہ اوڑھ رہے ہیں،شکستہ حوصلے شیرِ یزداں بن رہے ہیں نام ونسب پراجارہ داروں کے دن گھٹ رہے ہیں،بے نام،بے حسب،بے نسب صدیوں سے غلامی درغلامی میں زندگی گھسیٹنے والے آفتاب وماہتاب کی طرح زندگی کے جوبن میں اٹھکیلیاں کررہے ہیں پہلی باراس خطہ زمین میں لوگ زندگی ڈھونے کے بجائے اسے جینے کے لئے رخت سفر باندھ چکے ہیں،مگرآسان نہیں کیونکہ زندگی کے دشمن تاک میں ہوتے ہیں ایسے نایافت ہستیوں کے،ایسے صدا منوروتابان مشعلوں کے،ایسے روشنی کے میناروں کے۔۔۔جن سے ایک دہر رہنمائی لے رہا ہے۔۔۔جوتاریکی میں سسکتی ایک دہر کوایک روشن وتوانا دہر سے ملانے کا تاب رکھتے ہیں تیرگی میں زندگی بتانے والے آنکھوں کوچندھیانے والے روشنی کا نظارہ کراسکتے ہیں۔۔۔ان پرایک دہر فدا ہوتا ہے۔۔۔عظمت ان کا گُن گاتا ہے۔۔۔بلندوبالا چوٹیاں ان کے سامنے سرتسلیم خم کرتے ہیں،پابہ جولاں اسیرانِ وطن ان کے ہمت وحوصلے کی وجہ سے زندگی سے چمٹے رہتے ہیں۔۔۔عفت وآبرواُن میں خودکومجسم دیکھتے آج ہمارا شبیرزندگی اورروشنی کے دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔۔۔تیرگی کے خلاف لڑتے لڑتے آج ایک تنگ وتاریک کوٹھڑی میں جکڑا ہوا پڑا ہے زندگی اورروشنی کے رعنائیوں کا نظارہ کرنے والے آنکھوں پردبیز پٹیاں سختی سے بندھی ہیں۔۔۔زندگی کے لئے گرمجوشی سے رقصاں نرم دل پربرف کی بھاری سلیں ہیں۔۔۔کوچہ تیرگی میں زندگی اورمحبت کے سراغ میں ادا کی چال چلتے پاؤں میں نفرت کے بیڑیاں ہیں۔۔۔ہائے رے،محبت میٹھے بول بولتے لب فریب ودغا کے دھاگے سے سِل چکے ہیں۔۔جہاں کوئی

مونس وغمخوار نہیں۔۔۔بس تیرگی ہے، تیرگی ایسی کہ روشنی کا گزر نہیں، دور ورتک کوئی جگنو نہیں ایسی مخلوق سے واسطہ کہ جس نے تہیہ کیا ہوا ہے کہ زندگی اور روشنی کے متوالوں کو تیرگی کے سامنے سر بہ سجود کرے گا اور دشمن خوش کہ شبیر زنداں میں مقید نہ صرف اپنے کئے پشیمان ہے بلکہ اوروں کے لئے عبرت کا سامان بن چکے ہیں۔دشمن خوش کہ اب کون ہے جو ایسا بننے کی آشا رکھے، کون ہے جو سمبل وریحان کو چھوڑ چھاڑ کر خار وطن پر مر مٹے، کون ہے جو شبیر کو دیکھ کر زندگی کو زندگی بنانے کا تمنا رکھے۔دشمن خوش کہ اب فکر وطن کی سوتوں پر سوکھا چھا جائے گا محبت درندگی کا روپ دھار لے گا۔۔۔مجنون لیلیٰ کی شکل دیکھنا گوارا نہیں کرے گا۔۔حانی منی وطن کے بجائے 'شاد باد' کا گونج سنائی گا۔۔۔عفت وآبرو جان کی امان پر لٹنے کے لئے تیار ہوگا مگر عقل کے پیادے دشمن کو کون سمجھائے کہ شبیر اپنی زندگی ہی میں جسم سے بالاتر روحوں میں ڈھل چکا ہے، شبیر فرد نہیں جس کی عدم موجودگی میں کاروان زندگی رک جائے ایسے ہستی زندگی کا محرک ہیں جو لاکھوں میں متحرک ہے، جسے تم شبیر سمجھ کر زندان میں قید کر چکے ہو وہ کب کا ہزاروں دلوں کی غزالی دھڑکنوں میں شامل ہو کر مچل رہا ہے کیونکہ شبیر زندگی اور روشنی کا استعارہ ہے۔۔۔شبیر زندگی کا استعارہ ہے زندگی کے لئے جی رہا ہے۔۔زندگی کے لئے درد جھیل رہا ہے۔۔۔زندگی کے لئے، امرتا کے لئے درد کے بہاؤ میں بہہ رہا ہے۔۔۔زندگی کی لذتوں سے آشنائی کے لئے درد کی کھٹنائیاں سہہ رہا ہے۔۔۔شبیر حسینی قافلے کا وہ مرد حر ہے آج لشکر یزید میں پابند سلاسل سہی مگر اُن ہزاروں میں آزاد ہے جو شبیر بن چکے ہیں۔۔۔جو شبیر بننے کی آشائیں رکھتے ہیں۔۔۔جو شبیر کی صورت میں زندگی کی صورت گری کر رہے ہیں۔۔۔جو درد کے بھٹی میں زندگی کا کندن بن رہے ہیں۔۔۔جو غم کی وادیِ تیرگی میں جگنو کی طرح چمک رہے ہیں جو انگاروں پر زندگی کا پھول کھلا رہے ہیں۔۔۔جو غنیم کے سامنے سیسہ پلائی بن رہے ہیں۔۔۔جو حسین ہیں۔۔۔جو سرمست ہیں۔۔۔جو سرمد ہیں۔۔۔جو شہیک ہیں۔۔۔۔جو امداد ہیں۔۔۔جو رضا ہیں۔۔۔ شبیر زندگی، شبیر زندگی کا استعارہ۔۔۔۔کوئی مجھے یہ تو بتائے کہ زندگی کے سیلِ روان کیسے رک سکتا ہے۔۔۔گو کہ آج زندگی خاک وخون میں لتھڑی ہوئی سہی۔۔۔درد کی پاتال میں سہی۔۔۔۔وقت کے ہاتھوں پامال سہی۔۔۔حاکم کے ہاتھوں یرغمال سہی۔۔۔گو کہ زندگی آج ساہوکار کے رہن میں ہے۔۔۔ساگرِ ظلمت کی نہنگ کے دہن میں ہے۔۔۔کڑی وقت کے جام میں درد کے گھونٹ پی رہا ہے۔۔جس کی فضا میں جی رہا ہے۔۔۔دَم اس طرح گھٹ جاتا ہے کہ آشائیں مٹ جاتے ہیں مگر زندگی سخت جان ہے۔۔۔جینے کی تمنا شاشان وبولان کی استقامت پا چکے ہیں۔۔یہ ہار ماننے کے لئے تیار نہیں کیونکہ اس کا جنم اُس مٹی سے ہوا ہے جس نے غلام محمد پیدا کیا۔۔۔جس نے اللہ نذر پیدا کیا۔۔۔جس نے زاہد پیدا کیا۔۔۔اور سلسلہ بھی رکا نہیں۔۔۔اب بھی زندگی کا جنم میں ہو رہا ہے بموں، توپوں، مارٹروں، ہیلی کاپٹروں کے گڑگڑاہٹ میں۔۔۔لٹتے کاروانوں میں۔۔۔جلتے کھیت، کھلیانوں میں۔۔۔اجڑتے، بستے بستیوں میں۔۔۔زندگی کا ظہور ہو رہا ہے، زندگی سے لڑنے کے لئے، زندگی پر فتح پانے کے لئے، شبیر بننے کے لئے۔۔۔کیونکہ شبیر زندگی کا ستعارہ ہے۔

ناتمام

مثالِ عشق نہیں ملتی

کتابوں میں، افسانوں میں، قصے کہانیوں میں

ڈاکٹر جلال بلوچ

اے شبیر تجھے یہ احساس ہے کہ آواران تیرے بنا کیسے جی رہا ہے، اے شبیر کیا تو جانتا ہے کہ "جھاہو" تیری جدائی کے غم میں کتنا اجڑ چکا ہے، اے شبیر تجھے "کولواہ" کا حال معلوم ہے؟ جہاں تیری جدائی اس خطے کی آنکھوں کا نور آنسو بہا بہا کر لے گئی، کیا تجھے خبر ہے کہ "مشکے" کی رونقیں تیری مسکراہٹ کے جانے کے ساتھ ہی جاتی، رخصت ہوگئی، کیا تجھے کچھ علم ہے کہ "دشت" کتنا بے دولت ہوگیا ہے، کیا تو اس بات کی خبر رکھتا ہے کہ "تربت، مند، پسنی، اور تمپ" تیرے بغیر کس حال میں ہیں، کیا" گوادر" کی خوشیاں تجھ سے وابسطہ نہیں تھی، یہ بحر بلوچ اب بھی تیرے غم میں اُداس ہے، تیرے جانے کے بعد "خاران، نوشکی، چاغی" بلکہ پورا" رخشان" جدائی کے صدمے سے دوچار ہے، "بیلہ، خضدار، سوراب و قلات" کے آنسوؤں کا حال تجھے کسی نے دیا کہ وہ تیرے جانے کے غم سے نڈھال ہیں، کیا تو "مستونگ اور شال" کے دکھ سے واقف ہے جو تیرے غم میں اجڑے ہوئے ہیں۔۔۔ بولان کے وہ میٹھے چشمے، سبی کی بہار، نصیر آباد کی ہریالی اب قصہ پارینہ بن چکے ہیں، کوہ سلیمان کے چرواہیں اب لیلڑی بھی المیہ نغموں کی صورت میں گنگنا رہے ہیں۔۔ کیا" گورکوپ" کا وہ مچ کھدہگ جہاں سے ظالموں نے تجھے ہم سے چھین لیا، تجھے الہام تو ہوگا کہ وہ تیری حفاظت نہ کرنے کی پاداش میں اپنی ہریالی کھو بیٹھا ہے۔۔۔ یہ ہے دھرتی کا حال میرے شبیر، جسے تیری محبت نے عشقِ مجنوں کو مات دینے پہ اکسایا۔۔۔ عجیب قصے، یہ منفرد کہانیاں، یہ لازوال افسانے یہ سب چشم دید حقیقتیں ہیں جن کا نظارہ بے نور آنکھیں کر رہی ہیں، جنہیں سماعت سے محروم بھی سن رہے ہیں۔۔۔ جہاں پہ لوگ اس دھرتی کے دیوانے ہیں اور یہ دھرتی تیری دیوانگی میں اپنے غم رو رہی ہے، اپنے حواس کھو رہی ہے۔۔۔ یہ کیسا دکھ ہے؟ جس کا مداوہ دیدار یار سے ممکن، جس کی خوشیاں تیری شیرین آواز سے ممکن، جس کی بہاریں تیری مہک سے وابسطہ، جس کی حرکت قلب کی واپسی تیرے نقش پاء سے آئے، نہیں تو غم یار کی صعوبتوں کے دور میں کسی کی شنوائی قبول نہیں بس مغموم زندگی کی راہ کا راہی بننا ہی گوارا ہے۔۔۔ سنو۔۔۔ دھرتی کیا کہہ رہی ہے کہ تیری آواز سنے بغیر یہ ممکن ہی کہاں کہ مجھے مسکراہٹوں اور قہقہوں کی بہار ہو نصیب ہو۔۔۔ عشق و محبت کی ایسی داستانیں تو کسی نے تحری ہی نہیں کی، نہ کبھی کسی سے سنا کہ کوئی شبیر جیسا تھا، شبیر منفرد ہے، شبیر سب سے الگ ہے، شبیر تو وہ ہستی ہے جس پہ نازاں ہونے کے لیے الفاظ ہی ایجاد نہیں ہوئے جو گل زمین سے مہر شبیر اور شبیر سے گل زمین کی مہر و وفاء کو بیان کر سکے۔۔۔ اے شبیر کیا تو یہ ادراک رکھتا ہے کہ عزت جان، چراغ جان، احسان بھی تیری جدائی میں اتنے نڈھال ہوئے کہ رفیق جان کے ساتھ دیدارِ یار کی زیارت کرنے چلے گئے، ہمیں تنہاء چھوڑ دیا پر تیری محبت اور رہنمائی میں تیری راہ کے راہی بن گئے، یہ جانتے ہوئے بھی یہ جو راستہ ہے آگ سے گزر کے اس پار جاتا ہے، جان کی واپسی تو ممکن ہی نہیں، عضوء کوئی سلامت رہے تو اس کی خبر نہیں، پر کیا کریں کہ شبیر کے بغیر یہاں دل نہیں لگتا، ان

آنکھوں میں نیند کا خمار بھی ممکن نہیں جن میں عکس دوست سمایا ہوا ہو۔ہم کیونکر مسکرا سکیں گے یاروں کی محفل میں جہاں شبیر نہیں ہوگا، ہم کس طرح جواب دیں گے گلزمین کو کہ جہاں پہ بھی ہم سفر کریں گے۔۔۔اے شبیر تیرے بغیر، اس دیوان کا کیا مزہ جہاں تیری آواز نہ ہو، جہاں پہ تیرا عکس نہ ہو ۔۔۔ یہی عشق و دیوانگی، یہی مہر و وفاء جو انہیں اپنے ہمدم کے ساتھ اسی رستے پہ لے گئی جو تاریک کوٹھڑیوں کی طرف جاتا جہاں کسی کی آواز نہیں جاتی نہ روشنیوں کا سفر نہ جسم و جان کی سلامتی ۔۔۔ ہاں ایک اور بہت اہم بات جو میں بتانا بھول گیا کہ شبیر اماں گنجل نے تیری آواز اندھی اور بہری دنیا تک پہنچانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا، پر زندگی نے ساتھ نہیں دیا اور اسی جدوجہد میں وہ جان سے گزر گئی اور جاتے جاتے یہ پیغام دیا کہ کاروانِ شبیر نہ رک پایا ہے اور نہ ہی کوئی روک سکے گا۔۔۔اب ایک اور بات جسے رقم کرنے کے لیے اگر قلم نے جنبش نہیں کی، جسے کہنے کے لیے اگر لب سِل گئے، اگر لوح و قلم کچھ بیان نہیں کر سکے تو یہ کہانی بھی تاریک راہوں میں بھٹکتی رہیگی، یہ ایک اور محبت کا تذکرہ ہے جو کاغذ کی اور شبیر کی تھی۔۔۔ہاں شبیر کی کاغذ سے محبت کی۔۔۔اس کاغذ کی جو کتاب بن کے رہنمائی کرتی ہے، اور جس سے ہم اپنی سوچ کی پختگی، راہوں کے انتخاب، دنیا کو الگ نظر سے دیکھنے کا تعین کر سکتے ہیں، یہ وہ کاغذ جس پہ قصہ ماضی اور داستانِ زندگی رقم کرتے رہے ہیں، یہ کتابیں جو قوموں کے عروج و زوال کا سبب بنتی رہی ہیں۔۔۔وہ تحریریں جو ان کاغذوں پہ رقم تھیں، جو شبیر کے لیے آنکھوں کا نور اور راستے کے لیے مشعل بنی جس سے وہ اپنی صحیح راہ کا تعین کر کے اس راہ کو اپنا یقین کامل سمجھتا تھا۔۔۔یہ کاغذ جو شبیر کی زندگی کی دھڑکنیں تھے، جن پر وہ لکھتا اپنی تحریریں اور دوستوں سے بھی وصول کرتا اور انہیں ارسال کرتا یہی کاغذ اس کے جینے کا بڑا ذریعہ تھے۔۔۔شبیر تیرے جانے کے بعد یہ کاغذ نے بھی ہم سے دوستی ترک کر دی۔۔۔ہاں اب نہ سگار، نہ گروک، نہ ہی سنگر اور نہ زرمبش ۔۔۔اب کاغذی صورت میں ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے ہیں اور تو اور اس ہلاکو خان نے وہ دکانیں، لائبریریاں اور گھر بھی نظر آتش کر دیے جہاں کی زینت، سوچ اور نظر کو وسیع کرنے والی کتابیں تھیں۔اب تو مشکل سے وہ اوراق ملتے ہیں جن سے دماغ کے دریچے کھل سکیں۔۔۔ان کاغذوں کو بھی فقط تیری ہی محبت نے ہم پر آگہائی کا مینہ برسانے کا حوصلہ دیا۔ہم نے ان سے سیکھا، اور بہت کچھ پایا، اور اب دیکھو کہ ان حُسن بھی تیرے جانے کے بعد رخصت ہو چکا ہے۔۔۔اے میرے دوست، میرے سنگت شبیر تمہیں تو گمنام عقوبت خانوں کی نظر کر دیا گیا۔جہاں یزید وقت کی بربریت کے قصوں سے کمزور دل افراد اپنے قلب کی دھڑکنیں تک بھول جاتے ہیں۔ایک جانب جہاں تجھے سپردِ آتش نمرود کیا گیا تو دوسری طرف تیرے کارواں میں شامل دوست تیری جدائی میں بے حد غمگین ہیں۔۔اور انہیں اس غم نے جوانی میں ہی ضعیف کر دیا ہے۔۔۔یہ دھرتی خزاں زدہ، دوست مغموم، گل زمین کی بہار روٹھ گئی ہے، ہم لوگ مسکرانا بھول گئے ہیں اور دھرتی پر آگ بھڑک رہی ہے، سب کی آنکھیں پُرنم رہتی ہیں، یہ مٹی تمہارے نقشِ پاء کی تلاش میں ہے، دوست تمہاری رہنمائی کو ترس رہے ہیں۔۔۔اب جو یہ گلزمین ہے جو دکھ سے بھرپور ہے مگر سلامت ہے، دوست ہیں جو زندہ ہیں، سلامت ہیں۔۔۔بس ایک امید، ایک یقین ہے کہ تم لوٹ آؤ گے۔۔۔شبیر تم لوٹ آؤ گے۔۔۔اور۔۔۔مسکراہٹیں پھر سے بکھر جائیں گی، یہ غم کے بادل چھٹ جائیں گے۔۔۔دھرتی کی خزاں بہار میں بدل جائے گی۔۔۔ہم سب دوست خوشی سے جھومیں گے۔۔۔ اب یہ اُمید۔۔۔یہی ہے۔۔۔جینے کا سہارا بھی یہی ہے۔۔۔ہمارے لیے، ہم سب کے لیے ۔۔۔تم جو تاریک راہوں کی روشنی ہو۔۔۔تم جو ایک نئے سویرے کی امید ہو۔۔۔

درد اور تکالیف سے بھرا دو سال اور لاپتہ شبیر بلوچ

سہراب بلوچ

دنیا بلخصوص بلوچستان میں پیدا کیے جانے والے انسانی بحران اور انسانیت کی تذلیل گزشتہ کئی عشروں سے تواتر کے ساتھ جاری ہیں مگر دوسری جانب دنیا بھر میں انسانیت کے بلند و بانگ دعویدار اور انسانی اقدار پر کام کرنے والے ادارے، این جی اور سول سوسائٹی کے دیگر ادارے دنیا میں انسانیت کی بقاء کے لیے استحصالی نظام کے خاتمے کے لیے کردار ادا کرنا در کنار بلکہ انسانیت کو دوام بخشنے والے قانون کو پسِ پشت ڈال کر انسانیت کے مقدس نام جو مالی جمع پونجی (معیشت) ان کے حصے میں آتی ہیں انہیں ذریعہ روزگار اور کاروبار بناتے پھر رہے ہیں۔ آج ہمارا خطہ اس نہج پہ پہنچ چکی ہے کہ مادر وطن میں پاکستان سمیت دنیا کے کئی ممالک جن میں چین، عرب ممالک اور ان کے باجگزار انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کے مرتکب پائے گئے ہیں۔ دورِ جدید میں ظلم کا یہ بازار فقط بلوچستان ہی نہیں بلکہ آج دنیا میں ایسے چند ممالک ہونگے جہاں انسان اور انسانیت پر درندگی اور احساس ندامت جیسی حرکات نہیں ہو رہی، وہ چاہے۔۔۔۔ مشرق وسطی، جنوبی ایشیا اور مشرقی ایشیا (چین کے ایغور) وسطی ایشیا سمیت یورپ میں بھی انسانیت کی اس تذلیل کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن انسانی حقوق اور انسانیت پہ بربریت کی جو داستانیں بلوچستان میں رقم ہو رہی ہیں ان کی شاید ہی کہیں مثال ملتی ہو۔ دو عشروں سے جاری پاکستانی بربریت جس کا شکار ۴۵ ہزار بلوچ اسیران کے روپ میں ظاہر ہو چکا ہے، جس کے سامنے آج چنگیزی بربریت بھی شرمندہ ہے۔ پاکستانی بربریت سے آج اس خطے کا کوئی محکوم قوم محفوظ نہیں ہاں البتہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ رونگٹے کھڑی کرنے والی داستانوں میں سے اکثر کا تعلق بلوچ قوم سے ہی ہے۔ اگر سلسلہ یوں ہی چلتا رہا تو دیگر اقوام بھی بلوچوں کی عکس پیش کرنے لگے گی۔ اس سارے منظر نامے میں پاکستان سمیت دنیا بھر میں انسانی حقوق کے نام پر بنائے گے ادارے عملاً کوئی اصولی کردار اپنانے میں ناکام ہو چکے ہیں یا دوسری بات جسے ان کے اس جمودی کیفیت کے کردار تقویت پہنچتی ہے کہ یہ ادارے فقط مال غنیمت بٹورنے تک محدود ہیں یا ان کے کردار کو دیکھتے ہوئے یہ بات بھی ذہن میں گردش کرتی ہے کہ، ان کے بننے کی وہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انسانیت کے نام پہ مال زر ایک منافع بخش کاروبار ہے جس سے ان میں سے بعض ادارے مستفید ہو رہے ہیں۔ بلوچستان جہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں گزشتہ ستر سالوں سے جاری ہیں جن میں پچھلے دو عشروں میں انتہائی تیزی لائی گئی ہے، ایسا بھی نہیں کہ ان خلاف ورزیوں پہ دنیا میں کوئی آواز اٹھانے اور سننے والا نہیں۔ آج بلوچستان میں ہونے والے انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں عالمی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرا چکی ہے البتہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان مظالم پر بظاہر کوئی بین الاقوامی مداخلت نہیں ہوسکا۔۔ یہی خاموشی، جانبداری اور غیر انسانی رویے پاکستان جیسی دہشتگرد ریاست کیلئے بلوچ نسل کشی اور اغواء و لاپتہ کرانے میں کسی حوصلہ افزائی سے کم نہیں۔۔۔۔ چنانچہ ان درد بھری تکالیف اور لمبی فہرست میں لاتعداد کہانیاں جو اسد اور احمد شاہ سے بھی قبل شروع کی ہیں، جو دنیا اور انسانیت کو جھنجوڑتی ہیں۔ جہاں ہر داستان دوسرے سے کئی زیادہ تکلیف دہ اور دل شکن ہے۔ انہی اندوہناک داستانوں اور بے شمار کہانیوں میں سے ایک طالب علم اور پرامن سیاسی کارکن سنگت شبیر جان عرف لکمیر کی ہے۔ جو

متحرک اور منظّم واحد بلوچ طلبا تنظیم بی ایس او آزاد کی مرکزی انفارمیشن سیکریٹری رہا ہے۔ جسے زیر بحث لانے کی کوشش کرتا ہوں تا کہ ضمیر اور ذہن پر پڑے بوجھ کچھ ہلکا ہوسکیں، اسی بوجھ کو کم کرنے کے لیے قلم کی سیاہی اوراق پہ بکھیرنے کی کوشش کرنے جارہا ہوں۔ نہ جانے الفاظ کا وہ زخیرہ استعمال کر پاؤنگا جو شبیر جیسے دوست کی شایانِ شان ہوں یا نہیں بہر حال اپنی کم ماہیگی کے باوجود قلم کو جنبش دینے کی حرکت کرہا ہوں۔۔۔۔ شبیر جان کم عمری میں ہمارا رہنما بنا۔ شبیر جان تنظیمی ذمہ داریوں کا ایک مثالی کردار رہا ہے جہاں یا جس فورم پہ کم عمری میں ذمہ داریوں کا ذمہ اُٹھانے والے اشخاص کا ذکر ہو۔۔۔ تو وہاں لکمیر ہمیشہ ہماری بحث ومباحث کا حصہ ہوتا ہے اور رہیگا۔ ایک ایسی شخصیت جو کم عمری میں ایسا رہنما بن گیا جو قومی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نبھانے کے ہنر سے واقف تھا۔ ایسے کردار صدیوں میں جنم لیتے ہیں جو کم عمری اور بلند پایہ علم کی بدولت کسی قوم کی رہنمائی کرتا ہو۔۔۔ شبیر جان جو ہر وقت چہرے پہ مسکان لیے اور باتوں سے دل جیتنے کے ہنر سے آشناء تھا۔ آج گمنام عقوبت خانوں میں معصوم مسکراہٹ اور الرجی جیسی بیماری کے ساتھ نہ جانے کس حال میں ہوگا۔۔۔ پڑھا لکھا لکمیر دوران زندان نہ جانے کن انقلابی رہنماؤں کے دوران زندان لکھے گئے کتب کو دہرا رہا ہوگا جنہیں وہ دوران طالب علمی میں پڑھا ہوگا، نہ جانے قوموں کی ترقی کے رازوں سے پردہ اٹھانے والے کن تصانیف کا مطالعہ کررہا ہوگا، نہ جانے قوموں کو رہنماء اصول عطاء کرنے والے کن کامریڈوں کے الفاظ دہرا رہا ہوگا، نہ جانے آج وہ بلوچ قوم اور زندان میں مقید اسیروں کی تکالیف دیکھ کر اپنی تکلیفیں بھلا کر نہ جانے کتنا مغموم ہورہا ہوگا،۔۔ یہ میں اس یقین کے ساتھ کہہ لکھ رہا ہوں کیونکہ شبیر ایسا ہی بلند پایہ شخصیت کا نام ہے جہاں وہ اکثر ہماری اور دیگر کارکنوں کی رہنمائی کے لیے کتابوں اور دنیا کی تحریکوں اور ان میں لازوال قربانیوں کا حوالہ دیا کرتا تھا۔۔ انکا کہنا تھا کہ کوئی قوم اس وقت تک اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک ان میں بلند پایہ استقلال نہ ہو، جب تک وہ علم سے محبت نہ کرتے ہوں، جب تک ان میں ایثار کا جذبہ نہ ہوں۔ شبیر جان اپنے تنظیمی پروگراموں اور سیاسی محفلوں میں کئی بار یہ ذکر کرچکا ہے کہ قومی بقا اور سرزمین کی بحالی میں لازوال قربانیوں کے سخت حقائق سے گزرتا پڑتا ہے۔ یہ سب کچھ کل ہم اسی لاغر بدن اور چہرے پہ مسکان لیے شبیر بلوچ کی زبان سے سنتے رہے۔۔۔ آج وہ خود پر ان سخت حقائق اور لازوال قربانیوں کے بے شمار اذیتوں کو سہہ رہا ہے۔۔ وہ کالی کوٹھڑیاں جہاں وہ بے شمار اپنے جیسوں کو پائے گا جو بلوچ قومی بقا اور آبرو کیلئے اپنے حسین دنیاوی خواہشات کو ٹکراتے رہے آج زندگی اور موت سے لڑرہے ہیں۔۔ آج بلوچ قومی وقار کیلئے لڑرہے ہیں۔۔ آج بلوچ دھرتی کی وت واجہی کیلئے فنا ہورہے ہیں۔۔۔۔۔ کن اور کس کو پتہ کہ ان کے باپردہ خواتین انکی بازیابی کیلئے دنیا کو یقین دلانے کی خاطر اور نام نہاد اداروں کے تسکین کی خاطر چہرے سے نقاب ہٹا کر یہ احساس دلا رہے ہیں کہ ذاکر جان ہمارا ہے، زاہد جان ہمارا اپنا ہے لکمیر جان ہمارے جگر کا ٹکڑا ہے جو جابرانہ اور وحشیانہ انداز میں دن دھاڑے سب کے سامنے پاکستانی ملٹری فورسز اغواء کرکے لے جاتے ہیں ان تاریک راہوں میں جہاں چشمِ عقاب بھی کام نہ آئے ۔۔۔۔۔ فرزانہ، سیما، مہلب، سمی سمیت تمام لاپتہ کیے گئے افراد کے خاندان نام نہاد انسانی حقوق کے علمبرداروں سمیت زرخرید میڈیا کے سامنے روز اپنوں کی خاطر نہ جانے کن سوالات اور رویوں سے دوچار ہوتی چلی آرہی ہیں یقیناً مجھ سمیت آپ سب نے سسکتی آہوں اور معصوم آنکھوں سے ٹپکتے آنسوؤں کو دیکھا ہوگا جو اپنوں کے پیار اور احساس سمیت انسانیت کی بقا اور سلامتی کیلئے نام نہاد تہذیب یافتہ

اقوام اور ترقی پذیر ممالک کیلئے کسی المیہ سے کم نہیں۔۔۔۔۔دنیا بھر میں موجود ممالک انسانیت سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ بدلتے ہوئے معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کے کشمکش میں انسانوں پر ڈھائے گئے مظالم سے بے خبر اپنے معاشی استحکام کو بہتر بنانے کیلئے روز نہ جانے کتنے قیمتی جانوں کے ساتھ سمجھوتہ کر چکے ہیں یا تا حال کر رہے ہیں، پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانوں پر ظلم ڈھانے والے ممالک کس منہ سے انسانی اداروں کو اپنے ملک میں انسانی بقاء اور سلامتی کیلئے کام کرنے کی تلقین کرتے ہیں یہ خود ایک کھلا تضاد ہے ان تمام کرداروں کے باوجود ہم بے سہارے محکوم اور متاثرہ اقوام اور خاندان انہی اداروں کو اپنے تکالیف کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں وہ اس لیئے کہ اپنوں کی جدائی اور تکالیف خاموش رہنے نہیں دیتا۔اسی طرح اپنوں کو بازیاب کرانے کی خاطر معصوم اور کم عمر بچیاں ماما قدیر کے ساتھ کھٹن اور دشوار گذار تاریخی لانگ مارچ کا حصہ رہے۔احتجاج کے مختلف ذرائع اپنائیں۔مگر نتائج مایوسی کے سوا کچھ نہیں رہا۔۔۔اسی طرح آج 4 اکتوبر 2018 شبیر جان کو لاپتہ ہوئے دو سال کا طویل اور تکالیف سے بھرا عرصہ بیت گیا مگر تا حال شبیر جان کا کوئی حال نہیں کہ وہ زندہ ہے یا خدانخواستہ دوسرے لاپتہ افراد کی طرح کسی اجتماعی قبر میں دفنا دی گئی ہو۔۔۔۔ان دو سالوں میں اگر کوئی اپنوں کا درد جاننا چاہتا ہو یا درد محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہو تو وہ لاپتہ شبیر جان کی بہن سیما کی اس ویڈیو کو ملاحظہ کریں جو اپنے لاپتہ پیارے بھائی کی بازیابی کیلئے کراچی پریس کلب کے سامنے لگائے گئے سندھی مسنگ پرسنز کے منعقدہ کیمپ میں بروز عید ریکارڈ ہو چکی ہے۔۔جو بعد میں سوشل میڈیا کے توسط میرے سامنے گذرا جو مجھے درد اور تکالیف کی دنیا میں لے کے گیا۔آج بے شمار لوگ روز اپنوں کی بازیابی کا انتظار کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو رہی ہیں جن میں لاپتہ شبیر جان کے لاپتہ کزن سفر بلوچ کی بیوی اماں گنجل اپنوں کے انتظار میں ہمیشہ کیلئے کھوچ کر گئی۔۔۔۔اس احساس اور بے حسی کے عالم میں روز نہ جانے کون کس کے غم میں اپنوں کو ہمیشہ کیلئے الوداع کرے گی۔۔۔فقط اتنا۔۔۔کہ درد ایک احساس کا نام ہے جو حیوانوں کو انسانیت سکھاتی ہے۔۔۔۔مگر ظالم کیلئے دورِ جدید میں محکوم اور مظلوم کو خاموش کرانے کا فارمولا بن چکا ہے۔۔۔

اپنا شبیر بلوچ

ایوب اسرار

میں ہمیشہ اپنے آپ میں رہتا ہوں یہی وجہ ہے کہ جب کسی دوسرے سے مخاطب ہوتا ہوں تو نہ آداب گفتگو کا خیال رہتا ہے نہ اختیار واقتدار کا گمان اور نہ عمر کی سیمائیں مجھے روک پھاتی ہیں اسی وجہ سے اکثر لوگ مجھے ایک ایکٹر سا تصور کرتے ہیں لیکن کیونکر نہ کریں جب بھی میں دوستوں کے مجلسی منچ پر جاتا ہوں بنا کسی اسکرپٹ کے ذھن میں لئے ہوئے، مگر باتیں ایسی ہی کرتا ہوں جیسے کسی اسکرپٹ کے ڈائیلاگ ہوں اور بے دم ڈائیلاگ مجھے اس منچ پر بطور جوکر پیش کرتے ہیں اور بسا اوقات بعض حرکتیں اگر دوستوں سے سہی نہیں جاتیں تو وہ معترض ہوجاتی ہیں اور مجھے میری غیر سنجیدہ رویوں کو سدھارنے کی جانب متوجہ کراتی ہیں تو تب مجھے پتہ چلتا ہے کہ مجھے اپنے آپ سے باہر نکلنا چاہئے تو یہیں سے اصل ایکٹنگ شروع ہوجاتی ہے جو میں بولتا ہوں وہ میرے الفاظ ہیں ہی نہیں تو وہ مجھ پر کیسے جچیں گی باڈی لینگوئج سے شکست کھا کر کردار اور گفتار دونوں کی جنگ ہار جاتا ہوں، انہی مجلسی منچوں پر میرے چند ایسے دوست بھی رہے ہیں جس سے میں بطور میں مخاطب رہا ہوں اور وہ بھی مجھے ہی سننا چاہتے تھے اور میرے اسکرپٹ میں خود کا کردار ڈھال کر معاون اداکار کا رول بخوبی نبھاتے تھے، انہی دوستوں میں سے ایک ہے شبیر بلوچ، جی ھاں وہی شبیر بلوچ جسے آپ سب بی ایس او کے سیکریٹری اطلاعات سمجھ رہے ہو بالکل آپ کی سوچ صحیح اور سا کم ہے لیکن میرے نزدیک شبیر کی سوچ کچھ مختلف ہے وہ بی ایس او میں اجتماعیت ڈھونڈتے تھے، سماج میں اجتماعیت کو پرونے کی سعی کرتے تھے بلوچ سیاست میں اجتماعیت کا علم بردار تھے لیکن ان کی اجتماعیت کے بھی کچھ الگ اوصاف تھے یہ نہیں کہ ہر مجمع انقلاب ہی کا منبع ہوسکتا ہے اسی لئے تو آج ہر کسی نے اپنا اپنا شبیر کھویا ہے۔ شبیر بلوچ ایک پولیٹیکل ورکر تھے اور امید خداوندی ہے کہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، دشمن کی شکست تک وہ ہمہ وقت متحرک تھے، اسی وجہ سے مجھ جیسے ناچیز لوگوں کو بار بار ان سے ملاقات کا سعادت نصیب ہوا وہ ہر جگہ دستیاب تھے ہر شہر ہر گاؤں اور ہر نگر میں بلوچ طلبا اور طالبات کو علم کی طرف راغب کرائے تا کہ وہ بلوچ تاریخ اور تحریک سے جڑے رہیں وہ اپنے شہری حقوق، قومی حقوق، علمی حقوق اور سیاسی حقوق سے باخبر ہوکر سیاسی جدوجہد میں شامل رہے، جس کی انہیں عالمی قوانیں اجازت دیتے تھے اور عالمی اِدارے انہی حقوق کے ضامن بھی ہیں اور انہی عالمی قوانین ہی استحصال کو مسترد کرتی ہیں تو شبیر بلوچ نے ابتدائی جدوجہد استحصال کے خلاف شروع کی کیونکہ بلوچ طلبا کے ساتھ علمی استحصال ہورہا تھا۔ واضح رہے کہ یہ استحصال کالونیل سسٹم میں جہاں کہیں بھی رہا ہے لیکن پاکستان میں اِس کی نوعیت بالکل مختلف ہے بلوچ قوم جس کی مہرگڑھ کی دس ہزار سالہ پُرانی تہذیبی تاریخ ہے جس کی کھوج لگانے والے بیشتر غیر بلوچ وعالمی اسکالر ہیں لیکن پاکستان بلوچ قوم کو جبراً اس کی تاریخی تسلسل سے توڑ کر نوری نصیر خان، چاکر و گھرام کے بجائے ٹیپو سلطان، محمود غزنوی، صلاح الدین ایوبی جیسے اپنے مجازی ہیروز جنہیں خود پاکستانی مورخ ڈاکٹر مبارک جیسے لوگ مسترد کر کے قابضین اور فاتحین کے القابات سے نوازتے ہیں یہ خود بلوچ قوم کے تاریخی وراثت کو مٹانے کیلئے علمی استحصال کے زمرے میں آتا ہے۔

شبیر بلوچ نے ایک ایسے دور میں سیاسی جدوجہد کا راستہ اختیار کیا جب شہید صبا دشتیاری جیسے اسکالرز اور نواب اکبر خان و غلام محمد بلوچ جیسے قومی

رہنماوں کوچن کر کر شہید کر دیا جا رہا تھا جہاں بلوچ من حیث القوم ہر طرح کی سامراجی، استعماری اور کالونیل استحصالی منصوبوں کے خلاف ہر محاذ پر مزاحم تھی، ایک طرف بلوچ قومی تاریخ کو مسخ کرنے کیلئے تاریخی کتب کے خلاف کریک ڈاؤن کر کے انہیں جلایا جا رہا تھا بلوچ گلزمین کے ذخائر کو لوٹا جا رہا تھا، استحصالی اور استعماری میگا پروجیکٹ کی آڑ میں بلوچ قوم کی نسل کشی عروج پر تھی درسگاہوں کو فوجی کیمپ میں بدلا جا رہا تھا، شبیر بلوچ جو کہ طلبا سیاست سے وابستہ تھے، اُن کی وابستگی بی ایس او آزاد سے تھی جس کے سینکڑوں رہنماوں کو اٹھا کر شہید و لاپتہ کر دیا گیا تھا تو شبیر بلوچ کو بھی غائب کر دیا گیا جس کی تا ہنوز پتا نہیں لیکن شبیر بلوچ ان تمام واقعات سے باخبر تھے کہ ان کے پیش رو قیادت کو قابض ریاست نے اپنی بربریت کا نشانہ بنایا ہے پھر بھی وہ اپنے قومی آزادی کے موقف پر قائم رہے شبیر بلوچ ایک مکمل کمنٹمنٹ اور نظریے کا نام ہیں جسے نہ کوئی مٹا سکتا ہے نہ مٹ سکے گا۔ لیکن ایک سوال عالمی اداروں اور انسانوں حقوق کے علمبرداروں سے ہے کہ کب تک بلوچ قوم اور ان کی سیاسی قیادت جو کہ عالمی مسلمہ قوانین کے تحت اپنی جدوجہد کر رہی ہے پاکستان کی بربریت کا شکار ہوتی رہیں گی اور دُنیا پاکستان کے جنگی جرائم اور انسان کش نظریات سے نظر چُرا کر بیٹھا رہے گا۔

شبیر جسے میں جانتا ہوں

قاضی داد محمد ریحان

مجھے بی ایس او کے چیئرمین سحر اب بلوچ نے بتایا کہ شبیر کی گمشدگی کے حوالے سے بی ایس او کمپئن کے سلسلے میں اپنے گزارشات رقم کروں، شبیر کا نام سنتے ہی میری آنکھیں بھر آئیں، دل غم سے بھر گیا، ہاتھ کپکپانے لگے۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے کسی نے میرا پرانا زخم کرید کر تازہ کر دیا ہو، درد کی ایسی ٹھیس اُٹھی کہ لمحہ بھر کے لیے میں اپنے آپ سے ہی بے خبر ہو گیا۔ میری نظروں کے سامنے شبیر کا چہرہ ابھرا، شیونگ مشین سے تراشی داڑھی، محبت چھلکاتی آنکھیں، جوانی سے بھرپور مزاج اور ہونٹوں پہ ایک دوستانہ مسکراہٹ، وہ عطا ہیں جو شبیر کسی کو بھی اپنی پہلی ملاقات میں بخش دیتے ہیں۔ ہم بی این ایم کے سیشن کے سلسلے میں کسی پڑاؤ پر موجود تھے، دوستوں کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ وہاں پر مجھے اس ہستی سے بھی شرف ملاقات حاصل ہوا جو بعد میں بی ایس او کے مرکزی سیکریٹری اطلاعات چنے گئے۔ ہماری سلام علیک پھر آگے چل کر مستقل ربط اور باہمی محبت کی مضبوط گانٹھ سے بندھ گئی۔ ہم اکثر کسی بھی موضوع پر گفتگو کرتے اور متفق ہو کر ہی ایک دوسرے سے وقتی رخصت لیتے، ہمیشہ مختصر دورانیہ میں ان کا پیغام آجاتا، نئے موضوع کے ساتھ وہ مجھ سے گویا ہوتے۔ پھر چار اکتوبر 2016 کو وہ منحوس خبر بھی آئی کہ شبیر کو پاکستانی فورسز نے دیگر بلوچ سیاسی کارکنان کی طرح اُٹھا کر لاپتہ کر دیا ہے، یہ عام خبر نہ تھی۔ کسی بھی شخص کی دشمن فورسز کے ہاتھوں اغوا نما گرفتاری کی خبر عام نہیں ہوتی ان کے وابستگان پر یہ قیامت کی گھڑی ہوتی ہے۔ ہم سے کئی قیمتیں چیزیں ٹوٹ جاتی ہیں، لاکھوں کا نقصان ہوتا ہے، حادثات میں قریبی عزیز مر جاتے ہیں اور ہم افسوس کے بعد صبر کر لیتے ہیں لیکن اگر ہماری سوئی جتنی چیز بھی کھو جائے تو ہم پورا گھر پھٹک دیتے ہیں، جب تک وہ نہیں ملتی ہم بے چین رہتے ہیں اور اس کی گمشدگی ہمارے دل پر کافی گراں گزرتی ہے۔ تو ایک جیتے جاگتے انسان کی گمشدگی پر کیوں کر خاموشی اختیار کی جائے، دل کو دلاسا دیا جائے کہ جو ہو گیا سو ہو گیا، اب کیا کر سکتے ہیں؟ یا ہم یہ مان لیں کہ انہیں ٹارچر سیلز میں اذیتیں دے کر قتل کیا گیا، سوگ منائیں، تعزیت کریں تاکہ انسانیت کے مجرموں کو بھی اس چیخ و پکار سے چھٹکارہ ملے؟ نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہئے ہمیں اپنے احساسات کو آواز کی صورت اجاگر کرنا چاہئے، ہمیں اپنے آنسوؤں کو من ہی من پی کر صبر کی بجائے انہیں بہنے دینا چاہئے تاکہ وہ سیلاب بن کر ظلم کے اس نظام کو اُکھاڑ پھینکیں۔ میں کبھی نہیں کہوں گا اسد شہید، احمد شاہ شہید ہزاروں سال گزر جائیں، یہ زندوں میں شمار ہوں گے اور ان کی زندگی کا حساب ریاست پاکستان کے کرتا دھرتاؤں پر واجب ہوگا کہ بتائیں ہمارے جگر گوشے کہاں پر ہیں؟ بے شرم ریاست کے متکبر حکمران کہتے ہیں کہ ہم نے اسد مینگل کو مار مار کر قتل کر دیا ہے یا کہ ہم علی اصغر بنگلزئی اور اقبال بلوچ کا شمار زندوں میں نہ کریں، بہت سے ایسے نام ہیں جن کے خاندان کو اطلاع دی گئی ہے کہ ان کو قابض فورسز نے قتل کر دیا ہے، لیکن ایسی باتوں پر یقین کر کے دل پر صبر کی سِل نہیں رکھی جاتی۔ ہمیں بلوچستان کی ہواؤں میں پھیلیاں چیخوں کو سننا ہوگا جو پاکستانی ٹارچر سیلز سے آرہی ہیں۔ وہاں اسد مینگل آج بھی اذیتیں سہہ رہے ہیں اور شبیر سمیت ہزاروں بلوچ ''بلاتفریق جنس و عمر'' ان

اذیت گاہوں میں موجود ہیں جن کے گرد ظلم و جبر کی دیواریں کھڑی کی گئی ہیں۔فرق نہیں پڑتا آپ شبیر لکھیں یا اسد، زاہد، غفور یا ڈاکٹر دین جان، سب ہیرے، سب بلوچستان کے بیش بے بہا خزانے ہیں جنہیں ہمارے سماج سے چھین کر تاریکیوں میں پھینک دیا گیا ہے۔شبیر میرے دماغ میں مصور ہے، میں اس تصویر کو اپنے دوستوں کو دکھانا چاہوں گا، اپنے بچوں اور آنے والی نسل کو، شبیر کے بچوں کو بھی۔وہ میری امیدوں کا مرکز ہیں، اس میں غلام محمد کی شبیہ ہے، وہ ہمارے رہنما ہیں جنہیں ظالم پاکستانی فورسز نے اُٹھا کر عقوبت خانے میں ڈالا۔وہ جو سمجھتا ہے کہ سوچ کو مقید کیا جاسکتا ہے، مسل کرنا بود کیا جاسکتا ہے۔ہوا ہے کبھی ایسا؟ سقراط قتل ہوئے، عیسی دار چڑھے، بھگت سنگھ کو ساتھیوں سمیت شہید کیا گیا۔مزدک کو کمانچیوں نے تیروں سے چھلنی کر کے بیک وقت ان کے ہزاروں پیروکاروں کو زندہ بگور کیا، تو مزدک مر گئے؟ اسکندر نے تخت جمشید کی اینٹ سے اینٹ بجادی پھر اس کے نقش قدم پر عرب حملہ آوروں نے ایرانی تہذیب کو مسخ کیا ہمارے پلے کچھ نہ بچا لیکن پیغمبر زرتشت کے تعلیمات آج بھی ایرانی النسل اقوام کے دل گرماتے ہیں۔اوستا کے بوسیدہ اوراق پر بکھرے ان کے نظریات پرانے لفظوں کی خوشبو بکھیرتے ہیں، لیکنا نوشیروان ساسانی اور مالک بن مروان جیسے حکمرانوں کی سوچ خود ان ہی کی تباہی کا موجب بنے اور اگر ان کا ذکر ہوتا ہے تو تاریخ کے اوراق میں ان کے کردار کی سرانڈ بھی اُٹھتی ہے۔یہاں تک کہ نابود ہونے والی امریکا کی بومیوں کو بے دریغ قتل کیا گیا، کیمپوں میں محدود کیا گیا، زبردستی عیسائی بنا گیا لیکن وہاں جب بھی مورخ لکھتا ہے تو وہ بھی ''جیرونیمو'' کی حقانیت کی گواہی دیتا ہے۔لیکن عصر حاضر میں جینے والے لکھاری، سماجی فعالین اور سیاسی کردار اکثر یتا لالچی ہوتے ہیں وہ اپنے حکمرانوں کے مکروہ چہرے پر اچھائی کی ماسک چڑھا دیتے ہیں۔ملکی مفادات، قومی سلامتی جیسے الفاظ گڑ لیے جاتے ہیں تاکہ قوموں کی آزادی کو بھوت بنا کر پیش کیا جاسکے۔ایسے حالات میں قابض قوم کے لکھاریاں تو اپنی منفعت ہی لکھیں گے مگر اپنے بھائی بند و بھی قریب قریب ان ہی کی نقالی کرتے ہیں، کچھ ان کا ڈنڈا ڈراتا ہے اور زیادہ تر یہ بچارے خوف پھیلاتے ہیں کہ چپ رہو، اُٹھا لیے جاؤ گے، مار دیئے جاؤ گے۔یہ کیسی زندگی ہے کہ ہم اپنے بنیادی حقوق کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتے؟ ہم عدالتی قتل اور ریاستی مظالم جیسے سنگین صورتحال کا تقاضا بھی نہیں کر سکتے کہ ہمیں اغوا کر کے قتل کرنے کی بجائے، اپنے ہی کالے قوانین کی تحت گرفتار کریں، کینگرو کورٹس میں لے جا کر سزائے موت دیں لیکن یوں گم کر کے انسانیت کی تذلیل نہ کریں، یہ مطالبہ بھی ناجائز ہے، یہ چیخ و پکار بھی قابل برداشت نہیں تو ہم اس زندگی کا کیا کریں گے؟ شبیر، شمشیر بدست نہیں قلم و کتاب سے نبرد آزما تھے، وہ اس پود سے ہیں جو ہم جیسے نالائقوں کی سیاسی حکمت عملیوں سے نالاں ہیں۔رومانوی نعروں سے بیزار بی ایس او کو مادر علمی کا درجہ دلانے میں وہ اپنے پیشرو قائد زاہد بلوچ کے نقش قدم پر چلنے والوں میں سے ہیں۔اس لیے انہوں نے انتہائی خطرناک حالات میں بھی اپنی تعلیمی سرگرمیوں سے کنارہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے لوگوں سے رابطہ کاری اور آگاہی پھیلانے کے عمل کو اپنی زندگی پر ترجیح دیا اور یوں اپنے فکری محاذ پر گرفتار ہوئے۔ان کی گرفتاری ہم پر یہ ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ ہم ان کرداروں کی قربانیوں کو، ان کے اُس نظریاتی پیغام کو جن کے لیے یہ جوانیاں لٹا رہے ہیں، سمجھنے کی کوشش کریں۔میں دشمن سے ان کی رہائی کی لاحاصل درخواست کرنے کی بجائے بلوچ طلبا کے سامنے شبیر کا سوال پیش کرتا ہوں کیا اس سوچ کو مقید ہونا چاہئے، یہ چلتے قدم بس رک جائیں، ہوگیا سفر؟ یا ہم آگے بڑھیں گے؟

رخصت اف اوار اُن سنگت

چراگ بلوچ

لکی یار ایک دوست اور نظریاتی سنگت ہونے کے ناطے گزشتہ ایک سال کی اپنی کارکرگی کا ذکر کرتا چلوں کہ اس دوران میں نے کیا کام سرانجام دیا ہے۔ جب سے آپ لاپتہ افراد کی لسٹ میں شامل ہوں گئے ہیں، تب سے میں روز خود کو کوستا ہوں، کہ کیسا دوست ہوں آپ سے اگر چہ مل نہیں سکتا لیکن آپ سے مکالمہ تو کرسکتا ہوں۔ اس لئے آج میں نے پکّا ارادہ کرلیا ہے کہ آپ سے مکالمہ کروں گا تا کہ آپ کی گمشدگی کا غم غلط کرسکوں۔ مگر اس دوران یہ مشکل پیش آئی کہ دس مہینوں کا قصہ کہاں سے شروع کروں، سوچ و بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ گزشتہ ایک سال سے جو اہم سیاسی واقعات رونما ہوئے ہیں، انہیں آپ کے ساتھ شیئر کروں، مگر آپ کو تو میری کاہلی کا بخوبی اندازہ ہے کہ میں کتنا سست الوجود ہوں۔ میں آج اور کل میں پھنس چکا تھا کہ میرے اور آپ کے مشترکہ کولواہ کے دوست دوستیں نے پہل کر کے آپ کو موجودہ سیاسی حالات سے آگاہی دلائی، اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ اس دوران میں نے جو کتابیں پڑی ہیں، ان کا زکر سرسری طور پر آپ سے کروں، کیوں کہ مجھے معلوم ہے آپ نے دس مہینوں سے کتابیں نہیں پڑی ہے۔ لکی، میرے ہمبل آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ جب آپ لاپتہ ہوئے تو مجھ سمیت تمام دوست تقریبا ایک مہینے تک کچھ کرنے کی اور لکھنے کی حالات میں نہیں رہے تھے۔ دوستوں نے بہت کوشش کی، مگر انہیں آپ کی عدم موجودگی کی وجہ سے الفاظ بھی اچھی طرح سے ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ مجھے تو اب بھی مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں کہ کیسے آپ کو مخاطب کروں۔ ایک فقرہ مشہور ہے کہ دوستی میں کوئی احسان نہیں کرتا بلکہ دوستی نبھاتا ہے، لیکن میں اس بات کا قائل نہیں، آپ ایک دوست ہو، ایک محسن دوست۔ اس لئے میں یہ انصاف نہیں کرسکوں گا کہ جو کچھ میں نے پڑھا ہے یا محسوس کیا ہے انہیں ہو بہو بیان کرسکوں۔ لکی، میں نے آپ کی گمشدگی کے ایک مہینے بعد جو پہلی کتاب پڑھا، وہ ایک مہروان دوست کا تحفہ تھا جسے ترکی کے شہرت یافتہ ناول نگار اورحان پامک کا سفید قلعہ تھا۔ اسے آپ نے بھی شاید پڑھا ہے۔ شاید اس لیئے کہ آپ نے اس کے پڑھنے کا زکر مجھ سے نہیں کیا ہے۔ پامک نے اپنے اس ناول میں زمانہ قدیم کے ممالک اور اُس وقت کے حکمرانوں کی خواہشات ،دولت کی ہوس، ایک دوسرے کے ساتھ تجارت، سمندری راستوں پر اُس وقت کے ممالک کی آپس میں لوٹ ماری کو ایک خوبصورت طریقے سے بیان کیا ہے۔ ناول کچھ اس طرح ہے کہ ناول کا کردار کہیں سفر پر جارہا ہوتا ہے کہ راستے میں ترکی کے بحری بیڑے کے مسلح قذاق انکی لانچ پر اچانک ہلہ بول دیتے ہیں اور جہاز کے تمام ارکان انکے قیدی بن جاتے ہیں، وہاں لوٹ مار کے بعد تشدد کرنے کے دوران ناول کا مرکزی کردار خود کو ایک کتاب پڑھنے میں مصروف کردیتا ہے تا کہ تشدد اور جیل کے وقت یہی کتاب کے خیال اسے پریشانی سے بچائے رکھے۔ دوران مطالعہ وہ بھی گرفتار ہوجاتا ہے تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ کون ہو، کیا جانتے ہو؟ وہ تشدد سے بچنے کی خاطر کہتا ہے کہ میں جہاز کا ماہرِ فلکیات ہوں میں استاروں کو دیکھ کر جہاز کی سمت کا تعین کرتا ہوں، تو اسی مناسبت سے مار پیٹ سے بچ جاتا ہے، دوران سفر مزید بخشش حاصل کرنے کی غرض سے کہتا ہے کہ میں ڈاکٹر بھی ہوں۔ اسکی ان صلاحیتوں دیکھ کر اسے شاہی دربار پر لے کر جاتے ہیں وہاں وہ شاہ کے قیدیوں کا علاج کرتا ہے جب شاہ کو

معلوم پڑھتا ہے کہ اسکے نئے آنے والے غلاموں میں سے ایک ماہر امراض ہے تو شاہ خوش ہوتا ہے۔ کیونکہ شاہ خود کسی مرض کا شکار ہوتا ہے مگر کسی سے اسکا زکر نہیں کرتا۔ اس نئے قیدی کو بادشاہ کے حکم سے وہاں لے جایا جاتا ہے، وہاں وہ بادشاہ کا اعلان کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس غلام کے ہنر سے متاثر ہوکر بادشاہ اس غلام کو ایک ''آزاد غلام'' کے ہاں بیجا جاتا ہے تا کہ وہ اُس کی علم میں اپنی علم سے اضافہ کر سکے۔ وہاں اس پر ذہنی تشدد کے ساتھ ساتھ جسمانی تشدد بھی کیا جاتا ہے۔ تشدد کے دوران نیا غلام یہی سوچ رہا ہوتا ہے کہ اُس کے خاندان والے آئیں گے اور اس بادشاہ کی غلامی سے نجات دلائیں گے، مگر اسے آزادی کبھی نصیب نہیں ہوتی بلکہ بادشاہ اس کو ایک آزاد غلام کی حیثیت دے کر اپنے پاس رکھتا ہے، اسی حالت میں ناول اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بہترین ناول وہی ہے جو پڑھنے والے کو تجسس میں مبتلا کرے، آپ کی گمشدگی کے بعد جو دوسری کتاب میں نے پڑھا، وہ بھی ایک ناول ہی تھا۔ یہ ناول فیودر دوستوفسکی کا ''پاگل کی ڈائری'' تھا۔ یہ کتاب آپ نے یقیناً پڑھا ہوگا، لیکن قصہ بیان کرنے میں کیا حرج ہے۔ اس ناول کو پڑھتے ہوئے یہ خیال ذہن پر حاوی ہوجاتا ہے کہ اس کا مرکزی کردار میں خود ہوں۔ اس ناول کا قصہ ہر شخص ہے، ایک عام انسان جو ضدی بھی ہے، جو دوستی کرتا ہے، جو نفرت کرتا ہے، جو پریشان ہوتا ہے، غرض کہ پڑھنے والا اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں ہی پڑھ رہا ہے۔ کتاب کا نام ایک پاگل کی ڈائری ہے، جیسے فیودر دوستوفسکی نے پڑھنے والوں کو ابہام میں رکھا ہے کہ کردار کوئی خاص نہیں ہے مگر یہ کردار شاہد آپ کے اردگرد میں پایا جاتا ہے۔ وہاں ذکر کچھ اس طرح ہے کہ نامعلوم کردار خود میں ایک بحث کو چھیڑتا ہے کہ میں تو ہر فن مولا ہوں، کبھی کہتا ہے کہ میں بلکل ناچیز ہوں، ایک عام انسان، جو چھوٹی کامیابی سے بہت زیادہ خوش اور چھوٹی سے ناکامی سے مایوس ہوجاتا ہے۔ اسی کش مکش میں ناول اپنے اختتام کو پہنچ پاتا ہے، نامعلوم کردار آخر تک یہ تعین کرنے میں ناکام رہ جاتا ہے کہ مجھ میں کونسی صلاحیت پائے جاتے ہیں؟ اور میں کیا کرسکتا ہوں؟ پاگل کی ڈائری پڑھنے کے بعد ارادہ کرلیا کہ اب کسی ناول کو اٹھانے کے بجائے تاریخ کی ایک کتاب پڑھوں گا۔ تاریخ ایک ایسا مضمون ہے جو کسی لگی لپٹی کے بغیر گزرے واقعات کی کرداروں کو جارحانہ طور پر بے نقاب کرتا ہے۔ ایسے کرداروں کو پڑھنا دلچسپی سے خالی نہیں جنہیں تاریخ نے بے رحمی سے غدار، ضمیر فروش، قوم دشمن، وطن دشمن، اور نالائق کے القابات سے نوازے ہیں۔ تاریخ کا مضمون اس لئے بھی اہم ہے کہ دوسرے اقوام اور لوگوں کے بارے میں مطالعہ کرکے ان کی جدوجہد، دوران جدوجہد انکی کامیابیوں اور ناکامیوں کے اسباب نظر سے گزرتے ہیں، ان کو جان کر کسی حد تک اُن کی کمزوریوں کو دہرانے سے بچا جاسکتا ہے۔ قابض اپنے مقبوضہ علاقوں کے لوگوں سے کیا چاہتے ہیں یا اُن کے ساتھ قابض کا رویہ کیسا ہوتا ہے، یہ بھید بھی تاریخی کا مطالعہ کھولتا ہے۔ تو اسی مناسبت سے سبط حسن کی انقلاب ایران کی تاریخ پر کی جانے والی تصنیف کو منتخب کیا۔ اس کتاب کو پڑھ کر اس بات پر یقین محکم ہوگیا کہ انقلاب کی قیمت آسان نہیں ہوتی ہے۔ قابض جس نوعیت کا بھی ہو، وہ اپنی اجارہ داری کو قائم رکھنے کی غرض سے ہر جگہ کم وبیش یکساں جبر روا رکھتے ہیں۔ انقلاب ایران کا مطالعہ جدوجہد کی پیچیدگیوں، مشکلات اور حاکم کی جبر کو واضح الفاظ میں ظاہر کردیتا ہے، حالانکہ ایرانی انقلابیوں اور بلوچ جہدکاروں میں نظریاتی حوالے سے دن رات کا فرق ہے، لیکن یہاں جو چیز مشترک ہے وہ بلوچوں پر پاکستان کی جارحیت اور ایرانی انقلابیوں کے خلاف اُس وقت کے شاہ اور اس کے خفیہ ساواک کی بربریت ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میں نے اپنی دانست میں ایران کے شاہ اور پاکستان کے حکمرانوں کا تقابلی جائزہ لیا

تھا، اُس جائزے میں یہ بات واضح ہوگئی کہ حکمران طبقہ جب کسی قوم یا گروہ کو اپنی راہ میں مزاحم پاتا ہے تو ہر قسم کے جبر کو اپنا صوابدیدی اختیار سمجھتا ہے۔ ایران کی شاہ کے خفیہ دستوں نے ہزاروں لوگوں کو غائب کیا، ایرانی باغیوں اور اُن سے ہمدردی رکھنے والوں کی گھروں کو مسمار کیا، بہنوں اور ماؤں پر بے تحاشا ظلم ڈھائے، پاکستان بھی بلوچستان میں یہی سب کچھ کر رہا ہے، اس کتاب میں سبط حسن نے ایک ایسی تشدد کی منظر کشی کی ہے کہ بلوچوں کی موجودہ نسل اسی طرح کی تشدد کا عملاً شکار ہے۔ جب میں سبط حسن کی انقلابِ ایران پڑھ رہا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ساواک کے اذیت گاہوں میں اذیت سہنے والے آپ، چیئرمین زاہد، ذاکر مجید، دین جان، غفور، حاصل، رمضان، ارشاد، وسیم سمیت تمام بلوچ اسیران ہی کے متعلق پڑھ رہا ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُن لوگوں سے ہمارا ایک روحانی رشتہ ہے۔ ھمبل! اس کتاب کے بعد ایک مہربان دوست نے ارشد محمود کی کتاب ''ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ'' گفٹ کیا، ویسے کتاب سب سے بہترین تحفہ ہوتا ہے۔ ارشد محمود انسانوں کے اس بے حس ہجوم کو حقیقت پسندی پر مبنی تجزیہ کرتا ہے، اپنی کتاب میں ارشد محمود لکھتا ہے کہ پاکستانی معاشرے کی جمود کی وجہ ریاستی پالیسوں میں مذہبی بیانیہ ہی ہے، انہی پالیسوں کی وجہ سے معاشرہ ترقی کے بجائے تنزلی کی جانب حرکت پزیز ہے۔ پاکستان کے تمام ادارے بشمول تعلیمی ادارے جہاں ترقی کے راہیں متعین ہوتی ہیں، وہاں ترقی پسندی کے رجہانات قدرے زیادہ پائے جاتے ہیں، وہاں روشن خیالوں کا بسیرا ہوتا ہے، آج کل یہ ادارے بھی مذہبی دخل اندازیوں کی وجہ سے ترقی پسندی کے بجائے رجعت پسندی کے اڈے بن چکے ہیں۔، ویسے میرے مطالعہ کرنے کا رفتار سست ہے، لیکن آپ کی گمشدگی کو اب ایک سال سے زائد ہو چکا ہے، اس دوران میں نے مندجہ بالا کے علاوہ بھی چند چھوٹی بڑی کتابوں کا مطالعہ کیا جن میں ایک پاکستانی صحافی فیض اللہ خان کی ہے، جو طالبان کے ترجمان احسان اللہ احسان کو افغانستان میں انٹریو کرنے کی غرض سے جاتا ہے تو وہاں جاسوسی کے شبے میں گرفتار ہوتا ہے۔، وہ اپنے گزرے ہوئے واقعات کو ایک کتاب 'ڈیورنڈ لائن کا قیدی' کی شکل میں قلم بند کرتا ہے۔ ایک اور چھوٹی کتاب شردل غیب کا ایک ناؤلٹ ''آخری خط'' بھی پڑا، شیر دل غیب ایک بلوچ تخلیق کار ہے۔ اس کے بعد پاؤلو کوئیلو کا ناول ''سپاہی'' پڑھا، یہ ایک کمال کا ناول ہے جس میں ماتاہاری اپنے قوم وملت کی خاطر شہادت نوش کر لیتی ہے مگر قومی رازوں کو پاش نہیں کرتی ہے۔ وہ ایک حقیقی قومی ہیرو ہیں بن جاتی ہے ، جب میں یہ ناول پڑھ رہا تھا تو بلوچستان کی آزادی کے لئے پابند سلاسل قیدیوں اور اُن کی تشدد سے مسخ شدہ لاشوں کے واقعات یاد میرے آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ انسانی ذہن میں شاید ایک خودکار سسٹم موجود ہے کہ وہ متعلقہ واقعات کا لاشعوری طور پر تقابل کرنے لگ جاتا ہے۔ اس کتاب کے واقعات اور ہماری عملی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات میں یکسانیت نے میری تجسس بڑھا دی اور میں بے اس کتاب کے آئندہ واقعات کو جاننے کے لئے بے چینی کی کیفیت میں مبتلا ہوگیا۔ اس ناول کا کردار ماتاہاری اپنے وطن کے لئے شہید ہوتا ہے، ایسا صرف ماتاہاری کے ساتھ نہیں بلکہ ہر اُس شخص کے ساتھ ہوسکتا ہے جو اپنے وطن کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ ایسے کرداروں کو بلوچستان کا تقریباً ہر شخص جانتا ہے جو کل تک ہنستے کھیلتے زندہ نوجوان تھے اور آج 'شہید' ہیں۔ شیر دل غیب کا ناولٹ پڑھنے والوں کے مطابق مصنف کی عشقی داستان ہے۔ تخلیق کار کا کمال یہی ہے کہ وہ واقعات کی اس طرح منظر کشی کرے کہ واقعات عملی زندگی سے ہم آہنگ ہوں، شاید اسی وجہ سے شیر دل غیب پر یہ 'الزام' لگتا ہے کہ یہ ناولٹ اس کا اپنا عشقی داستان ہے۔ بہرحال جو بھی ہو، یہ ناؤلٹ عشق ومحبت کا داستان ہونے کی وجہ سے آج کل کے یونیورسٹی اور کالجز کے

نوجوانوں کوخوب اپنی طرف کھینچ لاتی ہے۔شیر دل چونکہ بلوچستان کا تخلیق کار ہے،اس لئے اُس کی تحریر میں بلوچستان کے واقعات کا تذکرہ بھی ملتا ہے،اس لیے تعریف کا بھرپور حق رکھتی ہے۔لکی، میں نے بہت سے دوستوں کی زبانی جارج آرویل کے ناولوں کا تذکرہ سن رکھا تھا تو آپ کو پتہ ہے کہ ہمارے دوست اتنے مہربان ہیں کہ جب کسی کتاب کا نام لوتو وہ کتاب چندلمحوں آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔جب میں نے جارج آرویل کا ناول اینمل فارم کا نام لیا تو کسی دوست نے اسی دن دلوایا۔یہ ناول فرضی کرداروں پر مشتمل ایک شاہکار ہے،اس ناول کے سارے کردار کسی فرضی نظریے کے لئے یکجا ہوتے ہیں اور پھران میں پھوٹ پڑتی ہے۔کردار کچھ اس طرح ہیں کہ جانور انسانوں سے بیزار ہوکر بغاوت کردیتے ہیں مگر وہاں اُن میں آپسی رسہ کشی اورانسانوں کی مکاری اُنہیں ایک دوسرے کے خلاف کردیتے ہیں۔کتے اورسور جو کہ اس فرضی نظام میں اثر ورسوخ کے مالک ہوتے ہیں انکی آپس میں ٹکراؤ ہوجاتی ہیں اور یہ ٹکراؤ انکے اُن کے نظام کی ناکامی کا سبب بنتا ہے۔انکی خواب ہوتی ہے کہ وہ اپنے لئے ایک عمارت تعمیر کریں گے مگر وہاں چاروں طرف سے سازشی عناصر درمیان میں آکر انکی تمام خوابوں پر پانی پھیر دیتے ہیں اور وہ آپس میں لڑکر اپنی دنیا قائم کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔کامریڈ اس ناول کے مطالعہ کے بعد جی چارہا تھا کسی اچھے لکھاری کا تاریخ کے موضوع پر لکھے گئے ایک کتاب پڑھ لوں۔ایک دن دوستوں کی محفل میں اوریانا فلاشی کی کتاب کا تذکرہ ہوا تو اسے پڑھنے کا ارادہ کرلیا۔اس کتاب کو حاصل کرنے کے بعد تقریباً چندہی دنوں کے اندر ختم کرلیا۔کتاب کا نام انٹرویوود ہسٹری ہے اوراس کا اردو ترجمہ 'تاریخ کا دریچہ' ہے۔یہ کتاب اپنے اندر ایک مکمل تاریخ ہے جو بیسیوں صدی کے اہم ترین شخصیات کی انٹریوز پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں انڈیا کی بہادر لیڈر اندرا گاندھی کا انٹرویو بھی موجود ہے۔اس کتاب میں جتنے بھی اشخاص کے انٹرویوز موجود ہیں،اُس وقت کے حالات وواقعات کے حوالے سے اُن کا اپنا نقطہ نگاہ بھی ہے۔ان انٹرویوز کو پڑھ کر کسی حدتک اُن شخصیات کو سمجھا جاسکتا ہے جو جنگوں کا سبب یا امن معاہدات کی وجہ بنے۔اس کتاب میں اسرائیل کی متاثر کن شخصیت 'آئرن لیڈی' گولڈا مئیر اور فلسطین کے جنگجو یاسر عرفات کی انٹرویوز بھی شامل کیے گئے ہیں۔یہ دونوں شخصیات تاریخی حوالے سے ایک دوسرے کے حریف ہیں،اس لئے فلسطین اور اسرائیل کے درمیان ہونے والی طویل مذاحمت، اس کے حل اور اسباب کے حوالے سے ان کا اپنا نقطہ نگاہ ہے۔یاسر عرفات اسرائیل کو تسلیم کرنے کے بجائے جنگ پر آمادہ ہے،گولڈا میئر اُن علاقوں سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں جن پر انہوں نے عربوں کو پسپا کرکے قبضہ کیا تھا۔یاسر اور گولڈا میئر آج اس دنیا میں نہیں لیکن فلسطین اور اسرائیل کا مسئلہ اب بھی جوں کا توں ہے۔فلاشی نے جارڈن کے شاہ حسین کو بھی انٹریو کیا تھا کیونکہ اسرائیل اور عرب جنگ میں مصر کے ساتھ جارڈن بھی جنگ میں شریک تھی،جنگ ہارنے کے بعد فلسطین کے گوریلہ دستوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ساتھ فلسطین سے بڑی تعداد میں عوام نے بھی نکل مکانی کرکے وہاں پناہ لیا ہوا تھا۔یہ پناہ گزین جارڈن کے لئے مصیبت تھے کیونکہ وہ جارڈن کے شاہ کو ایک حکمران نہیں مانتے تھے وہاں پناہ گزین ہوکر بھی خود کو خودمختار کرنا چاہتے تھے اس لئے جارڈن نے انہیں مار بھگا دیا تھا۔دوسری بات جارڈن کا اسرئیل کے ساتھ بھی تضادات تھے۔انٹرویو میں شاہ حسین فلسطینی پناہ گزینوں کی طرف سے پیدا کی جانے والے بدامنی کو تسلیم کرنے سے ہچکچاتی ہے۔لیکن بعد میں شاہ حسین خود فلسطینوں کو زبردستی جارڈن سے نکال باہر کرتی ہے۔اس کتاب میں اوریانا ہنری کسنجر کا انٹرویو بھی شامل کرتی ہے۔یہ وہ زمانہ ہے جب امریکہ ویتنام کی جنگ میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ویت کانگ کے مذاحمت کار امریکہ کی فوج کا

بے جگری سے سامنا کر رہے تھے، امریکیوں فوجیوں کی ہلاکت اور مالی نقصانات کی وجہ سے امریکی حکومت بھی شدید دباؤ میں تھی۔ فلاشی نے امریکی صدر کی پرسنل سیکریٹری مسٹر ہنری کسنجر کو انٹریو کیا تھا جو اس جنگ میں پیش پیش تھے دوسری طرف ویتنامی گوریلہ کمانڈر جنرل نیگوین گیاب کو بھی انٹریو کیا تھا دونوں کے انٹریو جنگ اور وہاں پیدا ہونے والے تباہی پر کے حوالے سے تھے۔ ویتنام جنگ کا مطالعہ کرنے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ عوام کو کوئی بھی طاقت شکست نہیں دے سکتا ہے۔ امریکہ دنیا کا ایک سپر پاور ملک ویتنامی عوام سے جنگ میں ناکام ہو جاتی ہے۔ اور یا نا فلاشی یونان کی آزادی پسند مسلح جہدکار پاپا پینا گولس، سائرس کے پادری اور آزادی پسند لیڈر آرچ بشپ میکریس، جرمنی کے چانسلر برائنٹ ولی کو بھی انٹریو کرتی ہے، ولی وہی چانسلر تھے جو مشرقی اور مغربی جرمنی 'جو جنگ عظیم دوئم کے بعد وجود میں آئے تھے' کو پھر سے ایک عظیم جرمنی کی شکل میں لانے میں کامیاب رہا تھا، یہ وہی چانسلر تھے جو یورپ کو متحد کرنے کا خواب دیکھ چکے تھے جو بعد میں حقیقت بن کر یوروپی یونین کی شکل میں وجود میں آیا تھا جو آج تک موجود ہے جو آج دنیا کی معاشی منڈی پر یورپی یونین کو خاص دست رس حاصل ہے۔ لکی! چونکہ تاریخ کا مطالعہ میرا شوق ہے، میں اس شوق سے چھٹکارا پانا بھی نہیں چاہتا ہوں۔ فلاشی کی کتاب کے مطالعہ کے بعد کسی دوست نے ڈاکٹر مبارک علی کا ''تاریخ کے نئے زاویے'' کا پی ڈی ایف بھیجا۔ مبارک علی کی یہ تصنیف اسکی مختلف ادوار پر لکھے گئے تاریخی واقعات پر مشتمل آرٹیکلز کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں ہندوستان کی تاریخ ، وہاں برطانیہ کا قبضہ بعد میں ہونے واقعات، بغاوتیں اور صادق اور میر جعفر کی کہانیاں اچھی طرح سے قلم بند کی گئی ہیں، یہ کہ کیسے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوگئی، سراج الدولہ کیسے مارا گیا، مسلم لیگ کی تشکیل کیسے اور کن وجوہات کی بنیاد پر ہوئی تھی، پاکستان میں بائیں بازو کی تحریکیں، پاکستان میں ترقی پسندی کے رجہانات کو کاؤنٹر کرنے کی ریاستی پالیسیاں، پاکستان میں طلبا یونین، اور یہ بھی کہ کیسے طلبا کو اپنے اصل سمت سے ہٹایا جاتا ہے، وہاں بی ایس او کا ذکر بھی کرتا ہے، مگر بی ایس او کا ذکر حقیقت پسندی پر مبنی نہیں ہے کیوں کہ مبارک علی بی ایس او کو بھی سراداروں کا ایک پریشر گروپ اور ہاسٹل میں حقیقی طلبا کی مار پیٹ والا پارلیمانی پارٹیوں کا ایک ونگ لکھتا ہے۔ ریاستی کریک ڈاؤن، بنگالی طلبا اور کراچی میں این ایس ایف کے کارکنان کی شہادت کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ ڈاکٹر مبارک اپنے اس کتاب میں اسٹوڈنٹس یونین پر پابندی کی وجہ ریاست کی پالیسیوں کو قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ریاستی پالیساں طلبا کو سیاست سے دور رکھنے کی ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ طلبا کی طاقت سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے ختم ہوتے ہی میں نے رسول حمزہ توف کے میرا داغستان کو مطالعہ کی نیت سے اپنے ہاتھوں میں رکھا مگر اس کتاب نے قدرے زیادہ وقت لیا۔ لکی! اس ناول کا تذکرہ آپ مجھے سے کر چکے تھے میں نے کہا تھا کہ ضرور پڑھ لوں گا، اور پڑھ بھی لیا، رسول اپنے اس ناول میں زبان ، قوم، اور وطن سے دوستی کی ایسے مثالیں پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والے دھنگ رہ جاتا ہے۔ رسول اپنے ناول میں اپنے داغستان سے محبت کا ذکر ایسے کرتا ہے کہ ہر پڑھنے والا یہی محسوس کرتا ہے کہ یہ تو ہمارے رسم و رواج اور اطوار کے متعلق ہے۔ موضوع پر رقم طراز ہوتے ہوئے لکھتا ہے کہ میرا موضوع ہی میرا وطن ہے وہ اس لئے کہ اپنے وطن پر لکھتے ہوئے قلم اور سیاہی دھوکہ دہی کے مترادف نہیں ہونگے، بعد میں رسول ہر قلم اُٹھانے والے کی طرف متوجہ ہو کر لکھتا ہے کہ لکھتے وقت موضوع پر بڑی سوچ و بچار کیا جائے ایسا نہ ہو کہ قلم راستے میں پسپا ہو جائے۔ ناول کے اندر قابلیت کے متعلق ایک باب بھی ہے۔ اس میں رسول کہتا ہے کہ قابلیت ایک خداداد صلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ محنت پر بھی منحصر ہے۔ جب محنت کرنے

والے اپنی قابلیت کو ڈھونڈ کر باہر نکالنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو بعد میں تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ کے لئے زندہ لوگوں میں اپنا مقام بنا پاتے ہیں۔لکی! اسکے علاوہ اور بھی چند کتابیں ہیں، موضوع میں طوالت کے پیش نظر ان کا تذکرہ پھر کبھی۔ کہتے ہیں امید سے دنیا قائم ہے اس امید کے سہارے ہی توقع ہے کہ ہم ضرور ملیں گے وہاں باتیں ہونگی، آپ بھی اپنے سفر کا ذکر کرینگے'' ہے نا''؟ اپنے ساتھ پابند سلاسل زندانوں میں اذیت سہنے والوں کا ذکر وگے۔خیر وہ بعد کی بات ہے آخر میں اپنے ایک حالیہ پڑھنے والے ایک کتاب نیلی نوٹ بک جو عمانوئیل کزا کیویچ کی قلم کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے، کزا کیویچ اپنی اس کتاب میں سوویت یونین کے پہلے صدر کمیونزم اور سوشلزم کی ایک نامی گرامی رہنما لینن کی روپوشی کا ذکر اچھی طرح سے کرتا ہے۔ جب فروری کا انقلاب ناکام ہوجاتا ہے تو سارے سوشلسٹ رہنماؤں پر زار کی فوج کا کریک ڈاؤن شروع ہوجاتی ہے، بہت سے لیڈر گرفتار ہوکر جیلوں میں بند کئے جاتے ہیں تو کئی کو جلاوطن کر دیا جاتا ہے، لینن کے پیچھے پڑ جاتے ہیں مگر لینن یہی پیٹروگراڈ کے ہی قریب پارٹی کے ایک پرانے پریوار کے ہاں روپوش ہوتے ہیں۔ یہاں سے مرکزی کمیٹی کو پالیساں دیتا رہتا ہے، اور اخبارات کے لئے آرٹیکل بھی تواتر کے ساتھ لکھتا ہے۔لکی اس ناولٹ کو پڑھنے کے بعد یہی محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کے تمام انقلابیوں کے لئے مشکلات ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اُنکی جدوجہد، آنے والے چلنجز، سہولیات کا فقدان، تشدد اور خوف کے ماحول میں تنظیم کاری، کامریڈوں کی شہادت اور گمشدگیاں اور اسکے بعد وقوع پذیر ہونے والے حالات، سخت حالات میں تنظیم کاری، رابطہ کاری اور تو اور پروپیگنڈہ کے ذریعے آج بھی زیادہ تر وہی اخبارات ہیں اور وہ بھی حکمرانوں کی بندشوں کی زد میں ہوتے رہتے ہیں۔اس ناولٹ کا سب سے اہم بات جو ہر پارٹی اور تنظیم پر آج بھی لاگو ہوتی ہے وہ یہ کہ لینن اپنے سیاسی رفیقوں کو یہی تجاویز دیتا ہے کہ ہمیں عوام سے ہمیشہ سچ بولنا ہے اگر ہم شکست سے دوچار ہورہے ہیں تو عوام کو تذبذب میں کبھی بھی نہ رکھیں اُنہیں یہی بتائیں کہ ہم یہ جنگ ہار رہے ہیں اور اگر فتح حاصل کر رہے ہیں تو اُس میں ہیرا پھیری نہیں کرنا چاہیے کہ سیدھا بول دینا چاہیے کہ ہم کامیابی حاصل کر رہے ہیں تاکہ وہ خود کو آنے والے خوشی کے ہر لمحوں سے بھرپور مسرت کے لئے تیار کرسکیں۔آخر میں انہی الفاظ کے ساتھ کہ

''لکی! رخصت اف آواروں سنگت''۔

شبیر میرا استاد

داس بلوچ

کوئی انسان جب سوچنے اور سمجھنے کا قابل ہوتا ہے تو پھر معاشرے میں ہونے والی تبدیلیاں اور لوگوں کی روزمرہ کی سرگرمیاں اس کے علم میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔ معاشرے کا طور طریقہ جیسا ہو، وہ اسی ماحول کو اپناتا ہے۔ ایک باشعور ذہن اکثریت کی طرح خاموش رہنے یا لکیر کا فقیر بننے کے بجائے سوچتا ہے، معاشرتی تفریق اور ظلم و جبر کے بارے میں سوچتا ہے۔ یہی سوچ ایک حساس شخص پر یہ واضح کرتا ہے کہ معاشرے دو طرح کے ہوتے ہیں، آزاد معاشرہ یا غلام معاشرہ۔ آزاد معاشرے کے لوگوں اور غلام معاشرے کے لوگوں کی سوچ یہ فرق ہے کہ اول الذکر بہت سی پابندیوں سے آزاد ہو کر اپنے لئے معاشی و سیاسی راہوں کا انتخاب کر سکتا ہے، جب کہ اس کے برعکس غلام معاشرے میں لوگوں کا اختیار کسی چیز پر نہیں، حاکم قوتیں غلاموں کی قسمت میں جہالت، غربت اور بے تعلیمی لکھ کر انہیں ذلت کا شکار بناتے ہیں۔ بلوچستان بھی موخر الذکر میں شمار ہوتا ہے، کیوں کہ گزشتہ سات دہائیوں سے بلوچوں کی قسمت کا فیصلہ ان کے اپنے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ لیکن یہ معاشرہ ہمیشہ سے زرخیز رہا ہے، غلامی اور تشدد کے باوجود بلوچستان کی زمین نے ایسے کردار پیدا کیے ہیں کہ وہ غلامی کی تاریکی میں چمکتے ہوئے آزادی کی امید کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں میں سے ایک شبیر (لکمیر بلوچ) ہیں۔ بلوچستان کی آزادی کے لئے جاری اس جدوجہد کی وجہ سے بیشتر نوجوانوں کی وابستگی بی ایس او آزاد سے رہی ہے، اسی لئے بی ایس او کے جتنے بھی کامریڈ اغواء یا شہید ہو چکے ہیں، بی ایس او کے تمام ممبران ان سب کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر جانتے ہیں۔ لیکن میرا اور شبیر کا قصہ مختلف ہے، کیوں کہ ایک ہی علاقے سے تعلق کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے زیادہ قریب رہے ہیں۔ لکمیر سے میری شناسائی اسکول کے زمانے میں ہوا جب لکمیر اور اس کے چند دوست ہر ہفتہ ہماری اسکول کا دورہ کرتے تھے۔ لکی اُس زمانے میں اپنی دوستوں میں کم عمر تھا اس لئے دوست اسے 'چھوٹے' کہہ کر پکارتے تھے۔ اسی اسکول میں میری اور لکمیر کی نزدیکی ہوگئی۔ بی ایس او میں زندگی اس حوالے سے عام زندگی سے مختلف ہے کہ یہاں عام باتوں کے بجائے ایسی باتوں پر مباحثہ ہوتا ہے جو کہ اسکول میں کبھی بھی سننے کو نہیں ملتی ہیں۔ قوم پرستی، آزادی، انقلاب اور اس جیسے کئی اصطلاحات جو بی ایس او میں شمولیت کے بعد ہماری محفلوں میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں، اس سے پہلے ہمارے لئے یہ الفاظ اجنبی تھے۔ اسکول میں شبیر اپنے دوستوں کے ساتھ ہر ہفتے کو دورہ کرتا تو اس طرح کی باتوں کو لیکر وہ مباحثہ کرتے اور ہمیں بھی ان بحثوں میں شامل کرتے۔ پھر یوں ہوا کہ میں بی ایس او کا باقاعدہ ممبر بن گیا، شبیر آواران زون کے مختلف عہدوں پر سرگرمیاں انجام دیتا رہا اور میں بطور جونیئر اس کا ساتھ رہا۔ شبیر میرا استاد ہے۔ شبیر لباچ، ڈن سر کا رہنے والا ہے، غلامی کی وجہ سے بہت سے علاقوں کی وجہ شہرت منشیات فروشوں، چوروں اور ڈاکوؤں کی موجودگی ہوتی ہے۔ اسی طرح لباچ بھی منشیات کے عادی لوگوں کی وجہ سے انہی کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن اسی لباچ ڈن سر سے شبیر نے سر اٹھایا اور اپنی ہمت کی وجہ سے بلوچ تحریک میں اپنا ایک مقام بنایا۔ مجھے یاد ہے کہ جب 2011 میں ایک احتجاج کے

دوران چند سرکاری دفتر نذر آتش ہوئے تھے تو احتجاج کے تیسرے دن بھرے بازار میں علاقے کے ایک مقامی غنڈے نے شبیر کو تشدد کا نشانہ بنایا اور الزام لگایا کہ اس نے دفاتر کو آگ لگائی ہے۔ اس نے شبیر کو دھمکی دی کہ وہ آئندہ احتجاج میں شریک نہ ہو، لیکن اپنی پاؤں کے فاصلے پر دیکھنے والے کم نظر یہ کبھی بھی نہیں سمجھ سکتے کہ آزادی کے لئے سرگرم کارکن دھمکیوں سے کہاں پیچھے ہٹے ہیں؟ اس واقعے کے بعد فورسز نے بھی شبیر کے گھر پر چھاپہ مارے، کئی جھوٹے مقدمات میں شبیر کو نامزد کر دیا گیا، لیکن ان کھٹن حالات کے باوجود شبیر پیچھے ہٹنے کے بجائے ہمیشہ ہنستا، مسکراتا اپنی سیاسی سرگرمیوں میں مشغول تھا۔ شبیر اپنے دوستوں میں لکی کے نام سے پکارے جاتے تھے، تمام دوست لکی سے بہت متاثر تھے، کیوں کہ مشکلات اور سخت حالات کبھی اس سے اُس کی مسکراہٹ نہیں چھین سکتے تھے۔ 2014 میں لکی کو بی ایس او آزاد نے مرکزی سنٹرل کمیٹی کے عہدے پر منتخب کر دیا، 2015 کی کونسل سیشن کو وہ مرکزی انفارمیشن سیکرٹری کے عہدے پر منتخب ہو گئے۔ بدقسمتی سے 2015 کے بعد میں لکی سے نہیں مل سکا، کیوں کہ کونسل سیشن کے بعد وہ دوسرے علاقوں میں تنظیم کاری میں مصروف تھا، ہماری حال حوال ہر وقت ہوتی تھی۔ گرفتاری سے ایک روز قبل لکی نے مجھے فون کر کے بتایا کہ وہ چند دنوں کے بعد آواران آ رہا ہے۔ میں اپنے دوست اور اپنے استاد کا منتظر تھا کہ 5 اکتوبر 2016 کو کسی دوست نے اطلاع دی کہ گزشتہ روز فورسز نے شبیر کو اٹھایا ہے۔ یہ اطلاع مجھے اس وقت ملی جب میں اپنے دوست اور مشکے زون کے آرگنائزر حاصل قاضی کی لاش کے پاس بیٹھا تھا۔ حاصل قاضی کو 5 اکتوبر کو کولواہ میں فورسز نے شہید کر دیا۔ ان دوستوں کی قربانیاں ہم سمیت تمام بلوچ نوجوانوں کے مشعل راہ ہیں، کیوں کہ زندگی سے بھرپور نوجوان اپنی خوشیاں، نوجوانیاں بغیر کسی ذاتی غرض کے قومی مقاصد کے لئے قربان کر رہے ہیں۔ جس قوم میں ایسے قیمتی اثاثے موجود ہوں، اُس قوم کو کوئی غلام نہیں کر سکتا۔

پھر بھی یہ گلہ ہے کہ ہم وفادار نہیں!

دوستین بلوچ

لاپتہ بھائیوں، بیٹیوں، سرپرستوں اور لاپتا خبروں کی سرزمین بلوچستان سے پانچ روز قبل کی خبر یہ ہے کہ تربت میں ایف سی اور پولیس کی بھاری نفری نے بلوچی زبان کے شاعر حفیظ رؤف کے گھر کو محاصرے میں لے رکھا ہے۔ چوں کہ بلوچستان میں اس طرح کی خبریں روز کا معمول ہیں، اس لیے پہلے روز اس جانب مجھ سمیت کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ البتہ ایک آدھ تنظیموں نے پہلے روز پریس ریلیز جاری کردی۔ اگلے روز کی خبر بھی یہی تھی کہ گھر کا محاصرہ چوبیس گھنٹوں بعد ختم نہ ہوسکا، خواتین و بچے تا حال محصور ہیں۔ یہ بات تو سوچنے والی تھی، اس لیے میں بھی سوچنے پر مجبور ہوا کہ ہماری سریع الحرکت فورسز کیسے ایک گھر میں موجود دہشت گرد کو چوبیس گھنٹوں کے بعد بھی گرفتار نہ کرسکیں۔ چوں کہ اس حوالے سے ہم سب صرف سوچ سکتے ہیں، اپنی سوچ کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرسکتے، اس لیے خود کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ گھر کسی کا بھی ہو، میرا تو نہیں۔ محاصرے میں موجود کم سن بچیوں اور خواتین کی پریشانی سے میرا کیا تعلق۔ اس معاشرے میں ہمارے خیالات بھی اتنے ڈھیٹ ہو چکے ہیں کہ چھوٹی سی تسلی سے سکون پاتے ہیں، بندہ خود کو تسلی دے کر خود کو مطمئن ہو جاتا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی حقیر ہوسکتا ہے؟! حقارت سے یاد آیا، کس نے کہا کہ ہم حقیر ہیں؟ اپنی دنیا کے بادشاہ ہیں ہم سب، کسی چوکی سے جب ذلیل ہو کر گھر پہنچیں تو اس شاہی انا کی تسکین کے لیے جو پہلا شخص گھر کی چوکھٹ پر آمد کا منتظر ہو، اس پر خوب برس پڑتے ہیں۔ برسنا چاہیے بھی، اگر درگزر کردیں تو شاہی انا کو اطمینان نہیں پہنچتا۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ تربت میں ایف سی نے کتابوں کی ایک اور دکان کو سیل کردیا. دکان مالک کو بیٹے سمیت حراست میں لے لیا، اور بعد میں رہا کردیا۔ دکان میں بلوچی شاعری کی کتابیں، روسی و امریکی ادب کی کتابیں شامل تھیں۔ یہ خبر پڑھ کر میں حیران رہ گیا کہ یہی کتابیں کراچی کی اردو بازار کی گلیوں میں بنڈلوں کے حساب سے رکھی گئی ہیں، وہاں ممنوع نہیں ہیں، لیکن بلوچستان میں کیوں کتابیں لاپتا کی جارہی ہیں۔ اچانک اس خیال نے اس گتھی کو سلجھادیا کہ بلوچستان کے علاوہ پاکستان میں دھرنا و سیاسی احتجاج بھی ممنوع نہیں، میڈیا کی خبریں بھی ممنوع نہیں ہیں، لاپتا شخص کی ایف آئی آر کٹوانا اور عدالتوں میں کیس دائر کرنا بھی ممنوع نہیں ہے۔ اس لیے بلوچستان کا باقی پاکستان سے موازنہ کرنا کوئی عقل کی بات نہیں۔ یہ خبر عبدالرحیم زیارت وال کے منہ سے بازیاب ہو کر پھر لاپتا ہوگئی کہ بلوچستان میں اسکول جانے کی عمر کے تیس فیصد بچے ہی اسکول جا پاتے ہیں۔ ظاہر ہے، اس نے انتہائی احتیاط سے اندازہ لگایا ہوگا۔ عبدالرحیم زیارت وال نے ہائی اسکولوں اور پرائمری اسکولوں کے بارے میں بھی حیرت انگیز انکشافات کیے۔ لیکن چوں کہ معاشرہ اب اجتماعی حوالے سے زخمی شامی بچے اومران دقنیش کی طرح کسی قسم کے تاثرات سے عاری ہو چکا ہے۔ اس لیے کسی نے اس جانب کوئی توجہ ہی نہیں دی کہ اس صورت حال کے ہوتے اگلے دس سال بعد کا بلوچستان کیسا ہوگا؟ تیسرے روز کی خبر پڑھیے؛ حفیظ رؤف کے گھر کا محاصرہ تیسرے روز بھی جاری ہے، کوئٹہ سے تین مسخ شدہ لاشیں برآمد۔۔۔۔ لاپتا افراد چوں کہ حرفِ غلط ہیں، اس لیے ان غلط حروف کو مٹانا عین قومی مفاد ہے اور

اس لیے اس کے خلاف آواز اُٹھا کوئی خود کو کیوں کر حرف غلط کی طرح مٹوائے۔ سو، لاپتا افراد کے حوالے سے سول سوسائٹی کی خاموشی، کالم نگاروں کی خاموشی اور میڈیا کی خاموشی سمجھ میں آ گئی۔ لیکن تیسرے روز بھی گھر محاصرے میں ہونے کے باوجود میڈیا، سوسائٹی اور دانش وروں کی خاموشی میرے پلے نہ پڑی۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح قومی مفادات کو خطرے میں ثابت کر کے گھر کے گھیراؤ کو جواز فراہم کر کے خود کو مطمئن کروں، لیکن میری کوشش بھی اس طرح کے جواز نہ گھڑ سکی۔ میں جواز ڈھونڈنے میں ناکام ہوا تو فوراً ٹی وی چینلز بدلنے لگا کہ اس مسئلے پر نیوز چلانے سے قومی مفادات کی تحفظ کو کوئی خطرہ لاحق نہیں، اس لیے کہ یہ مسئلہ ریٹنگ بڑھانے کے لیے ایک مصالحہ دار خبر لیے ہوئے ہے۔ لیکن مجھے ڈھونڈے سے بھی ایسی کوئی خبر نہ ملی۔ چوتھے روز دو خبریں آ گئیں: پہلی یہ کہ گھر کا محاصرہ جاری ہے، بی ایچ آر او کے کارکنوں نے مظاہرہ کیا ہے، تصویروں میں غنی پرواز کو بھی دیکھا۔ وہ سب یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ خواتین کا گھیرا؟ ختم کیا جائے، چار روز گزر گئے۔ چار روز مطلب چھیانوے گھنٹے، میں کیوں تصور کروں کہ چھیانوے گھنٹے تک خوف کے سائے میں زندگی بسر کرنے والی خواتین اور شیر خوار بچے کس حال میں ہوں گے۔ ویسے بھی دنیا چار دن کی ہے، ان چار دنوں کو کیوں میں کسی ایسی آرزو میں میں گزار دوں جن تک پہنچتے پہنچتے میرا نامعلوم مقام پر پہنچنا ضروری بلکہ بالکل ضروری ہو جائے۔ میں تو روزانہ بازار سے اپنے گھر جاتے ہوئے جان کی امان کی لالچ میں صرف یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ سرکار، میرا گھر چوکی سے توڑا آگے ہے، اگر آپ اجازت دیں گے تو میں جاؤں؟ سرکار اگر خوش گوار موڑ میں ہوں تو میری چاندنی ہو جائے، اگر بگڑے ہوئے ہوں تو پندرہ منٹ سورج کو تکنے، دو چار گالیاں سننے یا سرِ بازار مرغا بننے کے بعد ہی مجھے چوکی سے ذرا آگے اپنے گھر جانے کی اجازت مل سکتی ہے۔ اگر آپ اندرونِ بلوچستان رہ رہے ہیں تو ایک چوکی کراس کر کے گھر پہنچنے کے خوبصورت احساس کی اہمیت آپ بخوبی جانتے ہیں۔ اگر آپ لاہور یا ''را'' کے ایجنٹوں سے محفوظ کسی دوسرے شہر میں رہ رہے ہیں تو آپ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ یہ مبالغہ آرائی ہے۔ اچھا۔ اب آج کی تازہ ترین خبر سُنیں، بلکہ خبریں سنیں: تربت میں خواتین کا ڈی پی او آفس اس کے بعد ڈی پی او کے گھر اور اس کے بعد تربت بازار کے مین چوک پر دھرنا۔ چوں کہ ڈی پی او صاحب دفتر اور گھر پر موجود نہیں تھے، تربت جیسے پرامن شہر میں سرکار کا کوئی اعلیٰ افسر موجود نہیں تھا، اس لیے صوبائی حکومت کا کوئی نمائندہ، میرا مطلب ہے کہ کیچ ضلع کا ضلعی آفیسر مظاہرین سے ملاقات نہ کر سکا۔ سارا دن روڈ بند رہا اور دن ڈھلتے خواتین اپنی گھروں کو لوٹ گئیں۔ خواتین کی ذمہ داریاں بھی عجیب ہیں، سارا دن دھرنا بھی دے دیں، اور گھر کی ذمہ داریاں بھی نبھائیں، بے عقل ہیں عورت۔ آج کی دوسری خبر یہ ہے کہ خضدار کے علاقے زہری میں اسکول جاتے بچے کو بااثر ''معتبر'' کے بندوں نے فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔ ان معتبروں کے کارندے بھی بڑے فضول خرچ ہیں، اس بچے کا گلا گھونٹ کر وہ اسے ایک منٹ میں کوئی گولی ضائع کیے بغیر قتل کر سکتے تھے۔ وہ ہٹے کٹے قاتل زور سے چیخ کر اس کم سن بچے کے اوسان خطا کر سکتے تھے، اسے پانی میں ڈبو سکتے تھے، زندہ گاڑ سکتے تھے، اگر ایسا کرتے ہوئے جسم کے کسی حصے میں چھپی انسانیت آڑے آ جاتی تو وہ اس بچے کو زہر کھلا کر یا پلا کر بھی مار سکتے تھے۔ چوں کہ ''معتبر'' شخص کو خون چاہیے، سانس روک کر یا ڈبو کر بچے کو قتل تو کیا جا سکتا تھا، لیکن اس طرزِ قتل سے بچے کا خون نہیں بہہ سکتا، اس لیے گولی کا آپشن ہی استعمال کیا گیا۔ تصویر آپ سب نے دیکھی ہوگی، خون سے لت پت، اسکول یونیفارم میں ملبوس بظاہر سویا ہوا لیکن اصل میں ابدی نیند سویا ہوا بچہ۔ بلوچستان مستقبل میں ضرور فخر کرے گا کہ اس کے

فرزندان تاریک راہوں میں مارے نہیں گئے، بلکی روشنی کی تلاش میں اور روشنی پھیلاتے ہوئے مارے گئے۔ ئٹہ میں کتاب خون سے لت پت پڑی تھی اور مستونگ میں نوعمر طالب علم۔ ان تمام خبروں کو اغوا کرنے کے خلاف جو لوگ صدائے احتجاج بلند کرتے تھے، اُن کی پوری لاٹ ہی سی پیک کے نام پر بلی چڑھ گئی۔ اب ڈر سے چور اور عشائیوں میں ہونے والے دعوتوں کے نشے میں مخمور صحافیوں وسول سوسائٹی سے کوئی گلہ بھی نہیں کرسکتا، کیوں کہ گلہ تو اپنوں سے کیا جاتا ہے۔ گذشتہ پانچ دن میڈیا کے لیے، دانش وروں کے لیے، ٹاک شوز کے میزبانوں کے لیے ''ذراہٹ کے'' تھے۔ ان پانچ دنوں کی خبروں پر پروگرام منعقد کرکے وہ نہ قومی مفادات کے نقصان کا سبب بنتے اور نہ ہی غداری کا سرٹیفکٹ اپنے نام کرواتے۔ میڈیا اور دانش وروں کے لیے یہ ایک بہترین موقع تھا یہ ثابت کرنے کو کہ بلوچستان کی خبریں درجہ بندی کے بعد ہی غائب ہوجاتی ہیں لیکن وہ ناکام رہے۔ اب مجھ جیسا کوئی اسٹوڈنٹ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہے کہ بلوچستان میں کسی بھی نوعیت کا قتل ہو، کسی قسم کا بھی احتجاج ہو، یا حکومتِ وقت سے مطالبات ہوں، یہ سب میڈیا سے اس طرح ہی غائب کیے جاتے ہیں جس طرح کہ مشہور ملی گیت '' آؤ بچو سیر کرائیں تم کو پاکستان کی'' سے بلوچستان کا نام غائب ہے۔ میڈیا اگر سی پیک کے راستے میں آنے والے چھ ہزار سے زائد خاندانوں کی نکل مکانی کی خبر کو چھپاتا ہے تو بات ذرا پلّے پڑتی ہے، کیوں کہ اس طرح کی خبریں شائع کرنے سے ایک تو شکر سے میٹھی دوستی میں کڑواہٹ پیدا ہونے کا خدشہ ہے، دوسرا یہ کہ 'سی پیک آئے گا / بنے گا، خوش حالی لائے گا' والا نعرہ بھی مشکوک ہوسکتا ہے۔ لیکن میڈیا اس خبر پر بھی خاموش تھا کہ بلوچستان میں پانچ ہزار پرائمری اسکولوں میں صرف ایک کمرہ اور ایک ٹیچر ہی دستیاب ہے، اس مسئلے کو پاکستان کی آئینی حدود میں رہ کر کیسے حل کیا جاسکتا ہے؟ اس خبر پر بھی خاموش ہے کہ تربت میں آخر کیوں پانچ روز سے پانچ خواتین اور دو کم سن بچیاں محصور ہیں؟ اس خبر پر بھی صدائے احتجاج بلند نہ ہوسکی کہ خضدار میں ایک نوجوان کیوں کسی سردار کی انا یا بدلے کا شکار ہوگیا؟!

پھر بھی یہ گلہ ہے کہ ہم وفادار نہیں!

ایک مخلص دوست

حمید بلوچ

بی ایس او آزاد بلوچ معاشرے میں ایک جامعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو اپنے قیام سے لیکر آج تک بلوچ نوجوانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے انہیں شعوری طور پر تیار کر کے قومی غلامی کے خلاف جدوجہد کا درس دے رہی ہے۔ بی ایس او آزاد کی اسی شعوری جدوجہد نے بلوچ قوم کو ایسے ایماندار اور مخلص نوجوانوں سے نوازا ہے جو اپنے قومی آزادی کی جدوجہد میں ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ اور اس جدوجہد میں آنے والی ہر مشکل اور تکلیف کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ایسے ہی نوجوان ہی قومی تاریخ کو اپنی جدوجہد سے زندہ رکھتے ہیں ایسے نوجوان امر ہوتے ہیں جو اجتماعی مفادات کو حاصل کرنے کے لئے انفرادی مفادات کو پس و پشت ڈال دیتے ہیں۔ نوجوانوں کے اسی شعور جذبے اور ہمت نے وقت کے سامراجوں کو خوفزدہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ایسے نوجوانوں کو ہی ریاست اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیکر راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور آج بھی لاتعداد باشعور نوجوان ظالم ریاستوں کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں آج جہاں بھی قومی آزادی کی تحریکیں چل رہی ہے وہاں نوجوان ہی ریاستی پالیسیوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بنے ہوئے ہیں جن کو راستے سے ہٹانا قابض ریاستوں کے لئے ضروری ہے. بلوچ قومی تحریک جو گزشتہ 70 سالوں سے جاری ہے اس قومی آزادی کی تحریک میں نوجوانوں کا کردار قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے جان کی قربانی دیکر قومی تحریک کو زندہ رکھا اور اس تحریک میں بی ایس او آزاد کے نوجوان طالب علموں کا کردار کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ بلوچ قومی تحریک کے ہر دور میں بی ایس او کے طالب علموں نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا اپنے خون سے آزادی کی شمع کو بجھنے نہیں دیا بلکہ اپنے خون سے اس چراگ کو روشن رکھا. ان کی جدوجہد نے بلوچ معاشرے میں سیاسی تبدیلی کی بنیاد رکھی اور آج بی ایس او آزاد کے طالب علم بلوچ نوجوانوں کے آئیڈیل بن گئے ہیں۔ انہی نوجوانوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بی ایس او آزاد کے سینکڑوں نوجوان اغوا اور شہید ہو گئے ہیں۔ شہید کمبر چاکر، شہید حمید، کامریڈ قیوم، رضا جہانگیر، شفیع بلوچ، فدا بلوچ، حاصل قاضی، سالار بلوچ، رسول جان، وحید بلوچ، اور دیگر سینکڑوں نوجوان بی ایس او آزاد کے ہی کیڈر تھے جنھوں نے اپنی ذاتی خواہشات کو اجتماع کی بقاء کے لئے قربان کر دیا ہے۔ ذاکر جان، مشتاق بلوچ، زاہد بلوچ، آفتاب بلوچ، وسیم، ارشاد بھی اسی راستے کے مسافر تھے اور اندھیری رات کو ختم کرنے کے لئے شہیدوں کے نقش قدم پر چل پڑے لیکن ان محبت اور دوستی کے پیغمبروں کو سرزمین سے عشق کی پاداش میں اغوا کر کے غائب کر دیا گیا آج تک پتہ نہیں کہ یہ نوجوان کہاں اور کس حال میں ہیں۔ انہی نوجوانوں میں ایک نوجوان شبیر بلوچ عرف لکمیر جو 22 سال کے نوجوان طالب علم اور بی ایس او آزاد کے مرکزی انفارمیشن سیکرٹری تھے جنہیں 14 اکتوبر 2016 کو ریاستی خفیہ اداروں کے اہلکاروں نے تربت کے علاقے گورکوپ سے ان کی اہلیہ کے سامنے سے اٹھا کر لاپتہ کر دیا گیا، آج شبیر بلوچ کو آغوا ہوئے دس مہینے کا عرصہ بیت چکا ہے لیکن ان کی کچھ خبر نہیں۔ شبیر بلوچ کو بلوچستان کے دوسرے نوجوانوں کی طرح اٹھا کر لاپتہ کر دیا گیا لیکن اٹھانے والوں نے یہ نہیں بتایا کہ شبیر بلوچ کا کیا قصور ہے اس سے ایسا کونسا جرم سرزد ہوا ہے کہ اسکی سزا اسے غائب کر کے دی گئی وہ ایک سچا

عاشق تھا اپنے سرزمین کا. شبیر بلوچ محبتوں کی سرزمین کا فرہاد تھا جسے سرزمین کی محبت نے جدوجہد کرنے پر مجبور کیا. اس کا صرف ایک ہی قصور تھا کہ اس نے اپنے مظلوم قوم کے لئے آواز اٹھائی وہ نوجوانوں کو کتاب پڑھنے کا درس دیتا تھا اور اغوا کرنے والوں کو بھی معلوم تھا کہ ہم نے کسی دہشت گرد کو نہیں بلکہ کتاب کے رسیا ایک مظلوم پرامن سیاسی کارکن کو اغوا کیا ہے. اور ایسے سیاسی کارکن اس اسلامی ریاست کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔شبیر بلوچ ایک طالب علم اور پرامن سیاسی کارکن تھے وہ ایک سنجیدہ اور باشعور نوجوان تھے قومی غلامی کو انہوں نے بچپن سے ہی محسوس کرلیا تھا اور اسی احساس محرومی اور احساس کمتری کو ختم کرنے کے لئے 2008 میں صرف 15 سال کی عمر میں بی ایس او آزاد کو جوائن کر کے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا شال اور آواران زون میں اپنی ذمہداریاں مخلصی اور ایمانداری سے انجام دے چکے ہیں۔آواران زون کے صدر بھی رہے اور 2014 میں انہیں بی ایس او آزاد کی مرکزی کمیٹی کا اعزازی ممبر چن لیا گیا یہ وہ وقت تھا جب بی ایس او آزاد تنظیمی حوالے سے سخت مشکلات کا شکار تھی ایک طرف ریاستی ظلم و جبر اور دوسری طرف سوشل میڈیا میں بی ایس او آزاد کے خلاف منفی پروپگنڈے شدت کے ساتھ جاری تھے۔لیکن شبیر بلوچ اور بی ایس او آزاد کے مخلص کارکنوں نے اس مشکل دور سے بی ایس او آزاد کو نکالنے میں اہم کردار ادا کیا۔بی ایس او آزاد کے 20 ویں قومی کونسل سیشن میں وہ بی ایس آزاد کے مرکزی انفارمیشن سیکرٹری کے عہدے پر بلا مقابلہ منتخب ہوئے. شبیر بلوچ اپنی ذات سے زیادہ تنظیم کو اہمیت دیتے اور اپنا بیشتر وقت تنظیمی کاموں میں مصروف رہتے۔شبیر بلوچ جب اغوا ہوئے تو وہ زاہد بلوچ اور دوسرے کارکنوں کی طرح غیر مسلح تھے ان کے پاس ایک ہی ہتھیار تھا، وہ ہتھیار تھا شعور و زانت کا جس سے ہر سامراج خوفزدہ رہتا ہے۔اور ریاست نے اپنے خوف کو ختم کرنے کے لئے شبیر بلوچ کو اغوا کرلیا۔شبیر کا تعلق ایک ایسے علاقے سے ہے جہاں زندگی کے بنیادی ضروریات ناپید ہیں، آواران جیسے بڑے ضلع میں صرف دو انٹر کالجز ہیں وہ بھی فوجی کیمپ بن چکے ہیں، مگر شبیر کی تربیت کا کریڈٹ بی ایس او آزاد کے باشعور نوجوانوں کو جاتا ہے، یہ رضا ہی تھے جنہوں نے شبیر بلوچ کی لیڈرشپ صلاحیت کو پرکھتے ہوئے ایسے کم عمری میں ممبرشپ سے لے کر زونل لیڈرشپ تک لے آئے۔اگر قابض ریاست نے بلوچوں کو کچھ دیا تھا وہ احساس محرومی، احساس کمتری، مسخ شدہ لاشیں، اور منشیات کا زہر اسکے علاوہ پاکستان نے صرف بلوچوں سے طاقت کے زور پر انکی جدوجہد کو کاؤنٹر کررہی ہے۔ریاست کا یہ عمل کسی بھی شعور یافتہ نوجوان کو اسکی غلامی کا احساس دلاتا اسی غلامی کو ختم کرنے کے لئے اس نے پرامن طور پر سیاسی جدوجہد کرنے کا شعوری فیصلہ کیا۔بی ایس او آزاد کی شعوری جدوجہد نے شبیر بلوچ کو اس قدر مضبوط بنادیا تھا کہ وہ ریاست کی پالیسیوں کو ناکام بنانے کی مکمل اہلیت رکھتا تھا وہ پاکستان کے استحصالی نظام کا سخت مخالف تھا کیونکہ اسے ادراک تھا کہ استحصالی نظام میں بنائے گئے قوانین بلوچ قوم کی بقاء کے لئے خطرہ ہے اگر اس فرسودہ نظام کے خلاف جدوجہد نہ کی گئی تو بلوچ قوم کا وجود دنیا سے مٹ جائے گا اور اس استحصالی نظام کے خلاف پرامن جدوجہد کررہے تھے کیونکہ استحصالی نظام کا خاتمہ جہد مسلسل سے ہی کیا جاسکتا ہے۔شبیر بلوچ ایک پرامن سیاسی جہدکار اور انسانیت سے محبت کرنے والے انسان تھے اس کا کسی مسلح تنظیم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔صرف نوجوان طالب علموں کو اس بنیاد پر اغوا کرنا کہ وہ کیوں ریاست کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور کیوں آزادی کی بات کرتے ہیں شبیر بلوچ ان باشعور نوجوانوں میں شامل تھے جنہیں غلامی سے نفرت اور آزادی سے محبت تھا۔ایسے باشعور نوجوانوں کا لاپتہ ہونا دنیا کے انسانی حقوق کے اداروں کے لئے سوالیہ نشان ہے۔

انقلابی راہیں

خالد بلوچ

بعض ماہر نفسیات اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ انسان مفاداتی حیوان ہے، وہ اپنے مفادات کی خاطر کسی کو بھی دھوکہ دے سکتا ہے۔ کیونکہ انسان ہمیشہ اپنے انفرادی خواہشات کو حاصل کرنے کے لیے خودغرضی کا سہارا لیکر انسانیت سے لاتعلقی کا اظہار کر کے اپنے ذاتی خواہشات کو پورا کرتا ہے۔ لیکن معذرت دوستوں میرے کہنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ دنیا کے تمام انسان انفرادیت پسندی کے حامل ہوتے ہیں۔ جس طرح ہم انسانی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو چند ایسے ہستیوں کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے اپنی انفرادی خواہشات کو قربان کر کے اس سوچ کو ہی غلط قرار دیا کہ انسان مفاداتی حیوان ہے اگر واقعی انسان مفاداتی حیوان ہوتا تو دنیا میں کبھی بھی انقلاب نہ آتا اور نہ ہی کوئی برابری کی بات کرتا اور نہ ہی مظلوم محکوم سامراجی طاقتوں کو چیلنج کرنے کے بارے میں سوچتے اور نہ ہی کہیں انقلاب برپا ہوتا۔ اب لفظ انقلاب کا ذکر آیا تو الفاظ ساتھ دینے کو تیار نہیں کیونکہ انقلاب حقیقتوں کا سرچشمہ ہے اس میں جھوٹ اور فریب کی کوئی گنجائش نہیں جب موضوع انقلابی کامریڈوں پر آتا ہے۔ تو دل و دماغ میں کچھ سوالات جنم لیتے ہیں آخر انقلابی سوچ رکھنے والے انسانوں پر لوگ کیوں فخر کرتے ہیں۔ اس کی واضح مثال چی گویرا کی ہے جس کو ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ پسند کرتے ہیں کیونکہ چی کی زندگی انسانیت کی بھلائی تھی۔ میرے تحریر کا مقصد ایک ایسے نوجوان کی زندگی کے بارے میں ہے جو اپنی زندگی اجتماعی مفادات کے لئے قربان کرنے کو تیار تھا۔ اس انسان دوست کے کردار کو بیان کرنے سے پہلے میں سقراط کے اس قول کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ سقراط کہتا تھا کہ اصل زندگی جو علم حاصل کرنے میں گذاری جائے حقیقی معنوں میں وہی زندگی حقیقی زندگی ہے۔ سقراط نے درست کہا تھا لیکن بلوچ قوم ایک ایسے حالات جنگ میں مصروف ہے جہاں علم حاصل کرنے کے جرم میں زندانوں میں قید کیا جاتا ہے۔ بقول انقلابی سنگت نودان بلوچ کے انسانوں کو غائب کرنا کوئی نئی بات نہیں لیکن بلوچستان میں اسکے معنی دنیا سے مختلف ہے، یہاں غائب ہونے کا مطلب اپنی زندگی سے رخصت ہونے کے برابر ہے۔ بقول عزت جان کے لاپتہ افراد کے درد کا احساس لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا اور اب تک ایسا کوئی الفاظ ایجاد نہیں ہوا جو لاپتہ افراد کے درد کو کم کر سکے۔ لاپتہ افراد کا درد ایک اجتماعی درد بن چکا ہے۔ ان لاپتہ افراد کا ایک ہی جرم تھا انہوں نے فرسودہ سماج کے بوسیدہ نظام کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے اپنی زندگی کو قربان کر دیا۔ ان میں ایک شبیر بلوچ تھا۔ ان کو کم عمری میں ہی بلوچ قوم کی محرومیت کا احساس ہو 2008 میں 15 سال کی عمر میں بی ایس او (آزاد) کے پلٹ فارم سے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ شبیر کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا آزاد بلوچستان کی خاطر جدوجہد کر کے ایک پرسکون معاشرہ قائم کیا جائے۔ ایک بار شبیر نے کہا تھا کہ میں اپنے ہی حق کے لیے کیوں مروں حق بھی میرا اور زندگی بھی میری لیکن شبیر بلوچ قوم کا دشمن انسانی تاریخ و تہذیب سے ناآشنا ہے اگر اس ریاست کو انسانی جان کی قدر ہوتی تو یہ وحشی ریاست بنگلہ دیش میں ظلم کا بازار گرم نہیں کرتا۔ تاریخ میں اہم ترین کامیابیاں پرانے انداز فکر کو ختم کرنے اور اس سے ناطہ توڑنے کے نتیجہ میں سامنے آئی ہیں۔ شبیر جان نے بلوچ سیاسی کارکنوں کو احساس دلانے کی خاطر بی ایس او آزاد کے تنظیمی کاموں میں ہر وقت مصروف رہا، وہ ہمیشہ کہتے ہیں کہ

زندگی آزاد ہوتو زندگی کہلاتا ہے غلامی میں زندگی جہنم کا پس منظر پیش کرتا ہے۔آزادی کے اس جزبے اور شعور نے شبیر کو اس قدر پختہ کیا۔وہ ہمیشہ کہتا تھا مجھے پختہ یقین ہے کہ اس ظلم و جبر کے خلاف بولنے کی وجہ سے مجھے سخت حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔شبیر کو دو سال کا عرصہ ہو چکا ہے وہ ریاستی عقوبت خانوں میں تشدد برداشت کر رہا ہے۔آج بحثیت سیاسی کارکن مجھے فخر ہے میں ایک انقلابی طلبا تنظیم کا رکن ہو جس کے راھشون زندانوں میں انسانیت سوز اذیت برداشت کر رہے ہیں لیکن قومی تحریک سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں،اس لیئے ایک ماہر نفسیات آسٹروی اپنی کتاب میں کہتا ہے ذہنی کیفیت جسمانی اذیت کو قابل برداشت بنا دیتی ہے۔جب نازی جرمن قید خانوں میں ایک ماہر نفسیات فرینکل نامی یہودی نے انتہائی تکلیف دہ اور کربناک صورتحال میں بھی اپنے آزادی کے احساس کو مرنے نہ دیا۔شہید کمبر چاکر کہتا ہے ہمیں ریاستی ٹارچر سیلوں میں دشمن کو یہ باور کرانا ہوگا کہ ہم اپنی قومی آزادی سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔اگر انسان کا ارادہ پختہ اور مضبوط ہو تو اسے دنیا کی کوئی بھی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔اس عظیم نوجوان کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ آزادی بغیر قربانی کے نہیں ملتی۔لہٰذا بلوچ سیاسی کارکنوں کے خلاف ریاست کی جارحانہ کاروائیاں عالمی قوانین اور اصولوں کے منافی ہیں۔آج ہزاروں کی تعداد میں بلوچ سیاسی کارکنان ریاستی ٹارچر سیلوں میں قید ہیں ریاست اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ ظلم اور جبر سے قومی تحریک کمزور کیا جائے گا لیکن بلوچ سیاسی کارکنوں کی پختہ شعور نے عقوبت خانوں میں ریاستی تنخواہ دار ائی ایس آئی کو بوکھلاہٹ کا شکار بنایا ہے۔

شبیر بلوچ اور ہماری ادھوری مسکراہٹیں

مہلب بلوچ

انسان کا جذبات سے گہرا تعلق ہے کیوں کہ انسان ہمیشہ اپنے احساسات کا اظہار اپنے جذبات سے ہی کرتا ہے، کبھی غم وخوشی کے ذریعے اور کبھی مایوسی اور ناامیدی میں اپنے احساسات کو الفاظوں یا تحریر کے ذریعے بیان کرتا ہے تا کہ وہ ہلکان محسوس کر سکے۔ آج میں بھی اپنے ان احساسات کو بیان کرنا چاہتی ہوں اور میرے یہ احساسات ایک ایسے فرد کے لیے ہیں جس نے اپنے قول وفعل سے ہمیشہ ایک قائد اور ایک دوست کی حیثیت سے میری رہنمائی کر کے مجھے صحیح اور مثبت راستے پر گامزن کیا۔ وہ دوست، وہ قائد، سنگت شبیر بلوچ ہے جسے اس کے فعال کردار نے کم عمری میں قائد طلبا کے اعزاز سے نوازا۔ شبیر ایک ذہین طالب علم ہونے کے ساتھ ایک قابل اور مخلص سیاسی کارکن بھی تھے۔ شبیر نے دنیا بھر کے انقلابی جذبے سے سرشار نوجوانوں کی طرح کم عمری میں اپنے لیے پُرکٹھن اور مشکل راستوں کا انتخاب کیا کیوں کہ وہ ان نوجوانوں میں شامل تھا جو ہر طرح کے ظلم وجبر کے خلاف بولتے تھے۔ شبیر بلوچ نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز 2008 میں بلوچ طلبا تنظیم بی ایس او آزاد سے کیا۔ ان کا تعلق بلوچستان کے علاقے آواران سے تھا۔ 4 اکتوبر 2016 کو انہیں گورکوپ تربت سے اغوا کر کے لاپتہ کیا گیا اور تا حال ان کی کوئی معلومات نہیں ہے۔ شبیر بلوچ ایک ذہین و باشعور سیاسی کارکن تھے۔ شبیر سیاسی علم سے اس قدر لیس تھے کہ کوئی بھی شخص جب ان کی محفل میں بیٹھ جاتا تو ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ میں نے اُس میں وہ کشش پائی کہ وہ جس محفل میں بیٹھ جاتا تھا اس محفل کی جان بن جاتا۔ میں اس دن کو اپنے لیے سیاہ دن تصور کرتی ہوں جس دن مجھ جیسے طالب علم سے میرے دوست جیسے قائد کو میری محفل سے اٹھا کر انسانیت سوز اذیت گاہوں میں بند کر دیا گیا۔ آج میں نہیں جانتی کہ شبیر کس حال میں ہوگا لیکن میں اس بات کی گواہی دوں گی کہ شبیر جہاں بھی ہوگا وہ خوش ہوگا کیوں کہ شبیر کو اپنی سیاسی جدوجہد پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا مجھے پختہ یقین اس ظلم وجبر کے خلاف بولنے سے مجھے سخت حالات کا سامنا کرنا ہوگا اور ان سخت حالات کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی حوالے سے تیار ہوں۔ البتہ جسمانی حوالے سے وہ نہایت کمزور انسان تھا لیکن شبیر کے تمام دوست اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ نظریاتی حوالے سے ایک پختہ نظریاتی کارکن تھا۔ آج بحیثیت ایک دوست میں شبیر کو یاد کر کے ضرور پریشان ہوں ہو کہ وہ شبیر کو کھانے کے لیے کیا دیتے ہیں؟ اب سردیوں کے دن نزدیک ہیں، اس کے پاس کمبل نہیں ہوگا، تشدد سے اس کی

حالت کیا ہوگی لیکن بحیثیت ایک سیاسی کارکن میں اب بات پر بہت زیادہ افسردہ ہوجاتا ہوں کہ شبیر کے پاس وہاں کتابیں موجود نہیں ہوں گی، وہ کتابوں کا دیوانہ تھا، جسے پڑھنے سے بے حد لگاؤ تھا اور وہ کتابوں کے بغیر ادھورا ہے۔ آج میں روشنی میں بیٹھ کر اُس کو یاد تو کر رہی ہوں لیکن میری سوچ اندھیری کال کوٹھری میں ہے۔ آج میں اُس کی مسکراہٹ کو دیکھنے کے لیے بے چین ہوں۔ آج انسان، حیوان، چرند پرند، ہوائیں دریاؤں کی موجیں میرے لیے سب افسردہ ہیں کیوں کہ درختوں کی تازگی ہواؤں کی خوشبو اور سمندر کا شور سب کا تعلق شبیر سے ہے۔ آج میں یہ سوچ کر خوش ہوجاتی ہوں کہ میرا قائد کتابیں پڑھنے اور سیاسی شعور رکھنے کے جرم میں کال کوٹھری میں بند ہے کیوں کہ آج کل کے نوجوان شراب اور جوئے کے کیس میں پکڑے جاتے ہیں لیکن شبیر اُن کے برعکس ظلم کے خلاف جدوجہد میں غائب کر دیا گیا ہے۔ شبیر کی سوچ وفکر نے بلوچ طالب علموں کو جدوجہد کرنے کا درس دیا۔ یہ شبیر کی علم سے محبت ہے کہ آج ہر طالب علم کتابوں سے محبت کرتا ہے۔ آج شبیر ہمیں دیکھ کر خوش ہوگا کہ میں نے جس راستے کا انتخاب کیا، اس راستے پر آج ہزاروں نوجوان شبیر بن کر ظلم کے سامنے رکاوٹ بن کر کھڑے ہیں اور ظالم ہر نوجوان کو شبیر سمجھ کر اس سے خوف زدہ ہے، کیوں کہ شبیر ایک فرد کا نام نہیں بلکہ شبیر ایک ایسی سوچ اور ایک ایسے چراغ کا نام ہے جس کو کمزور ہوائیں نہیں بجھا سکتیں۔ آج جب میں ہنستی ہوں تو میری مسکراہٹ ادھوری ہے، اس کی وجہ یہ کہ ہزاروں رونے والوں کو ہنسانے والا شبیر بلوچ تاریک زندان میں بند ہے۔ شبیر کی محفل کو ایک سال کا عرصہ بیت گیا اور اس وجہ سے ہماری مسکراہٹ ادھوری پڑ گئی ہے اور ان ہزاروں چہروں پر مسکراہٹ اس وقت پوری ہوگی جب ہمارا رہبر ہمارے درمیان موجود ہوگا اور اس کی پُر رونق محفلیں دوبارہ شروع ہوں گی۔

انسانیت کے علمبردار شبیر بلوچ کی رہائی میں ناکام

محراب بلوچ

دوسری جنگ عظیم کے جنگ و جدل، جنگی بربریت، انسانی بحران، زور آور ملکوں کا کمزور اقوام کا استحصال، قبضہ، سامراجوں کا بے قابو ہوس، استعماریت کا پروان چڑھنا، انسانیت کے خلاف انسانی طرزِ طریقہ کاروں نے ایک نہ خوشگوار ماحول وفضا میں قائم کیا۔ مہذب لوگوں کو انسانیت کے تحفظ کیلئے ایک ادارہ بنانے کی ترغیب ذہن میں آئی، اس بنا پر ایک معقول ادارہ بنانے کی تخلیق کیلئے جدوجہد میں مصروفِ عمل رہے، اس جدوجہد کے نتیجے میں ایک ادارہ سرِ ظاہر وجود میں آیا۔ 24 اکتوبر 1945 کو یعنی اقوام متحدہ کے ادارے معرضِ وجود میں آئے۔ انسانیت کے نام پر عالمی امن وامان، سیاسی، معاشی، سماجی، لسانی مسئلے مسائل، معاملات سلجھانے کی ٹھان لی۔ آج تک یہ ادارہ یہی پرچار کرتا نظر آرہا ہے، دنیا میں جہاں انسانیت کے تذلیل مذہبی منافرت، سماجی، لسانی، معاشرتی ناانصافی، غیر منصفانہ رویوں کے خلاف جدوجہد ظلم وجارحیت کی روک تھام اس ادارے کی اولین ذمہ داریاں ہیں۔ 10 دسمبر 1948 کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے دعویٰ کیا کہ ہر انسان کی عزت اور انسانی مساوی اور ناقابلِ انتقال حقوق کو تسلیم کیا جائے گا اور انکی تحفظ کی جائے گی۔ دنیا میں آزادی، انصاف وبرابری اور امن کو بنیادی حقوق قرار دیا گیا کیونکہ ضروری ہے کہ انسانی حقوق کے قوانین کو محفوظ رکھا جائے، انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور تمام اقوام کیلئے حصولِ مقصد کا مشترکہ معیار ہوگا۔ ہر فرد اور ہر معاشرے کے ادارے اس منشور کو پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم، تبلیغ کے زریعے ان حقوق اور آزادی کا احترام پیدا کریں گے اور انہیں قومی وبین القوامی کاروائیوں کے ذریعے ملکوں میں ان اقوام میں جو ممبر ملکوں کے ماتحت ہوں، منوانے کیلئے بتدریج کوشش کرسکے۔ اس دفعہ تیس دفعات پر مشتمل امن چارٹر منظور کیا گیا، جس میں شخصی، شہری، سیاسی، معاشی، نسلی، انفرادی آزادی اقوام متحدہ نے منظور کرلیں۔ دفعہ نمبر 1۔ شخصی آزادی اسطرح کہ تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں انہیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے اس لئے ایک دوسرے سے بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیئے۔ دفعہ نمبر 5۔ میں کسی شخص کو جسمانی اذیت یا ظالمانہ، انسانیت سوز، یا ذلیل سلوک یا سزا نہیں دی جائے گی۔ اسی طرح دنیا میں بسنے والے ہر انسان کی امیدیں، امنگیں اقوام متحدہ کے ان بلند بالا دعووں پر مرکوز ہیں کہ ہماری عزت وحرمت، نفس کی حفاظت کیلئے ہمارا اہم قدم رہے گی۔ خاص کر ہر وہ خطہ سامراجیت کے زیرسائے میں تذلیل کی زندگی گذار رہا ہے، استعماریت کی

قوت کے شکار ہیں، ان کی امیدیں، امنگیں، اُن انسانیت کے علمبرداروں سے وابسطہ ہیں کیونکہ اقوام متحدہ دنیا کا سب سے بڑا انسانی حقوق کا ادارہ ہے۔ اقوام متحدہ کا یہ دعویٰ بھی ہے دنیا میں بغیر حسب ونسب ہر انسان کے حقوق کا تحفظ ہماری بنیادی ذمہ داری ہے اقوم متحدہ کے چارٹر کو دستخط کرنے والے ممالک کی زمہ داریاں ہیں وہ انکی تحفظ میں اہم کردار ادا کریں، اسی بنیاد پر اقوام متحدہ کے منشور میں وجود رکھتا ہے کہ کسی طاقتور ملک کو یہ اجازت نہیں کہ کسی کمزور ملک یا انسان کا استحصال کریں یا کسی قوم پر قبضہ جمائیں یا اپنی کالونی بنائیں۔ وہ سرزمین کی مال معدنیات، ساحل، وسائل کی لوٹ مار اور استحصال کریں اور کسی قوم کے کلچر، زبان، تہذیب، تمدن کی پائمالی کریں اگر اُن چیزوں میں سے جو بھی ہو، اقوام متحدہ کا فرض بنتا ہے کہ ایسے اعمال وحرکات کے روک تھام میں کردار ادا کریں، کیونکہ انکی بنیادی ذمہ داری ہے۔ پاکستان نے برطانیہ کے گھٹ جوڑ سے بلوچستان کو اس وقت نوآبادیت میں بدل کے، وہاں کے بسنے والوں باسیوں کے ساتھ غیر انسانی رویہ اختیار کر کے انہیں مختلف اذیت ناک تشدد، انسانیت سوز تکالیف ڈھاتا رہا ہے۔ جس میں سب پہلے بلوچ عوام کی انسانی بنیادی حق آزادی کو سلب کیا گیا، اب صورت حال یہ ہے کہ یہاں کے بسنے والے اہل علم دانشور، طالب علموں سے لیکر پروفیسروں تک، ڈاکٹر، بچے اور خواتین پاکستانی جارحیت سے محفوظ نہیں ہیں۔ پاکستان اپنے قیام کے ایک مہینے کے بعد اقوام متحدہ کا رکن ملک بنا، پاکستان نے اقوام متحدہ کے رکن بننے کے بعد سب سے پہلے تو اقوام متحدہ کی قوانین کے خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک آزاد، خودمختار ریاست بلوچستان پر قبضہ کر کے دورِ حاضر تک ظلم، جارحیت روا رکھا ہے۔ اقوام متحدہ کے دفعہ 5 میں کہا گیا ہے کہ کسی شخص کو جسمانی اذیت یا ظالمانہ، انسانیت سوز، یا ذلیل سلوک یا سزا نہیں دی جائے گی۔ لیکن بلوچستان میں انسانی تذلیل کجا! لوگوں کو اُٹھا کر غائب کر کے سالوں تک لاپتہ کرنے کے بعد ان کی لاشیں پھینک دی جاتی ہے۔ ریاستِ پاکستان من گھڑت باتوں سے اقوام متحدہ کے آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے۔ پاکستان میں انسانی حقوق کے علمبردار (ایچ آر سی پی) ہیومن رائیٹس کمیشن آف پاکستان کو بلوچستان کے لاپتہ افراد، انسانی اجتماعی قبریں دکھائی نہیں دیتے۔ یہاں سیاسی ورکروں کو غائب کر کے ان کی لاشیں ملنا بتدریج جاری وساری ہے، پاکستانی انصاف، عدلیہ کے پرچار کرنے والے خود فوج کے زبان میں بات کرتے ہیں۔ بلوچستان میں ہزاروں کے حساب سے بچے، جوان، بزرگ اور عورتیں پاکستانی اذیت گاہوں میں اذیت ناک زندگی گذار رہے ہیں، ایک طرف گمشدہ افراد کے کمیشن کے سربراہ اور سابقہ رٹائرڈ چیف جسٹس جاوید اقبال اپنے ایک بیان میں کہہ رہا ہے کہ بلوچستان میں لاپتہ افراد کی گمشدگی میں بیرونی ممالک کا ہاتھ ملوث ہے، لیکن بلوچستان میں روز پاکستانی فوج سرعام پوری آبادیوں کے سامنے کسی کے بھائی، کسی کے والد، کسی

کے بیٹے کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ بی ایس او کے اس وقت سینکڑوں کارکناں ورہنماؤں کو اغواء اور شہید کیا جا چکا ہے۔ بی ایس او کے مرکزی انفارمیشن سیکریٹری چوبیس سالہ شبیر بلوچ ولد عبدلصمد کو پاکستانی فورسز نے تربت کے علاقے گورکوپ سے انکے اہلیہ کے سامنے 4 اکتوبر 2016 کو اُٹھا کر غائب کر دیا۔ جسکے اب دو سال پورے ہونے کے باوجود وہ تا حال لاپتہ ہیں۔ شبیر بلوچ کی بہن سیمہ اور انکی اہلیہ زرینہ کراچی پریس کلب کے سامنے پرامن احتجاج کے تمام طریقے استعمال کر رہے ہیں۔ ایچ آر سی پی کی طرف سے آج تک ایک خوش کن حوصلہ افزائی سامنے نہیں آیا کہ شبیر جان کی رہائی میں کوئی تعاون کی جائے گی۔ شبیر بلوچ کے لواحقین کا کہنا ہے کہ شبیر بلوچ کو اگر ریاستی اداروں نے مشکوک سمجھ کر اُٹھایا ہے تو ہمیں اعتراض نہیں لیکن شبیر کے گناہ ثابت کریں، شبیر کو عدالت کے سامنے پیش کیا جائے، جو جرم ثابت ہوا انہیں عدالت کے مطابق سزا دی جائے، شبیر بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا ایک سرگرم لیڈر رہے، سیاسی جدوجہد پرامن طریقہِ کار کا حامی تھا، پرامن طریقہِ کار پر یقین رکھتے تھے۔ اقوام متحدہ کے منشور کے بہت سے پہلوؤں میں سے انسانی انفرادی آزادی کے ساتھ ساتھ اپنی ذات، نسل، ملک، زبان، کلچر، تہذیب کا حفاظت، دفاع کے ساتھ سیاست بھی ہر انسان کا حق ہے۔ اگر سیاست، انفرادی آزادی ملک، زبان، کلچر، تہذیب ہر انسان کا حق ہے تو بلوچ فرزندان حقوق سے کیوں محروم ہیں؟ اگر کسی انسان کو دوسرے انسان کی تذلیل وسزا کا حق نہیں، کسی کو گنجائش بھی نہیں تو بلوچ قوم کیوں ریاستی ظلم وجبر کا شکار ہے؟ اگر شکار ہے تو اقوام متحدہ کیوں خاموش ہے؟ دنیا کے مہذب اقوام میں سے بلوچ قوم بھی ایک تہذیب یافتہ قوم ہے، اسطرح انسانی تذلیل میں سب انسانی حقوق کے علمبردار شامل ہیں کیونکہ ظلم کے خلاف خاموشی اختیار کرنا ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ شبیر بلوچ سیاسی کارکن ہیں جو دنیا کے اصولوں کے مطابق اپنی جدوجہد میں مصروف عمل تھا، جسے مجرم کی طرح اٹھا کر غائب کیا گیا، شبیر بلوچ کسی جہادی مسلح تنظیم کا ممبر نہیں ہے، نہ کسی سے کوئی تعلق تھا بلکہ وہ پُرامن جمہوری طلبا تنظیم بی ایس او آزاد کا رہنما ہے۔ نہ ہی شبیر جیسا نوجوان دہشت کا ماحول پیدا کرتے ہیں، ایک طالب علم کے ناطے شبیر بلوچ جیسے ہزاراں نوجوان لیڈرز وورکرز کی گمشدگی ایک مظلوم قوم کے مقدر میں المیے سے کم نہیں ہے۔ بلوچ سیاسی کارکنان ورہنماؤں کی بازیابی کیلئے اقوام متحدہ سمیت سندھی، پشتون، اور بلوچ اہلِ قلم ودانشور اپنا کردار ادا کریں۔ اپنے اخلاقی فرض کو تاریخ میں سنہرے لفظوں میں نقش کروائیں، انسانیت کا پرچار کرنا ہر انسان کا اخلاقی فرض ہے۔

طلبا تنظیم کے رہنما شبیر بلوچ آج تک لاپتہ ہے

محسن بلوچ

بلوچستان کی حالات پر ہر وقت کچھ لکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو موضوع کا انبار لگ جاتا ہے تو سوچ میں گم ہو جاتا ہوں کہ کیا لکھوں، تو شش و پنج میں رہتا ہوں، روز کہیں نہ کہیں سے کوئی پاکستانی فوج کے ہاتھوں اغواء ہو جاتا ہے روز قصے بھی نئے ہوتے ہیں اُن میں سے ایک شبیر بلوچ ہے، جس کے اغواء کو 4 اکتوبر کو دو سال مکمل ہو جائیں گے، اس دوران وہ پاکستانی ٹارچر سیلوں میں باقی بلوچوں کی طرح اذیت سہہ رہے ہیں، شبیر بلوچ ایک ہونہار طالب علم ہے، شبیر جان کے بارے میں لکھنے کیلئے میرے پاس اتنے الفاظ نہیں۔ ریاست کے ظلم و ستم کو طشت از بام کروں، میں لکھاری نہیں ہوں کہ روز جبر کے داستان بیاں کروں لیکن مجبور ہوں مادر وطن پر نار کنے والی ظلم کو بیاں کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بہت کوششوں کے بعد آج میں کچھ لکھنے کیلئے خود کو راضی کر پایا، مگر پھر اسی سوچ میں ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں جس انسان کے بارے میں لکھ رہا ہوں اسکے ساتھ ناانصافی تو نہ ہو اور میں شرمندہ ہو جاؤں۔ بی ایس او آزاد ایک طلبہ تنظیم ہے، جسکے رہنماؤں سے لیکر کارکنوں کی قربانیوں کا طویل قصہ موجود ہے، جو نوجوانوں میں شعور پیدا کرنے کی پاداش میں دشمن کے ہاتھوں لقمہِ اجل بن چکے ہیں۔ سمجھنے کیلئے کچھ ناموں کا ذکر کرتا ہوں تا کہ سمجھنے کیلئے آسان ہو، جس میں رضا جہانگیر، الیاس نظر، قمبر چاکر، کمار جان، حاصل بلوچ، کمال بلوچ، اکرام اور بہت سے رہنما گذشتہ چند سالوں میں ریاست مظالم کے زد میں آکر شہید ہوئے ہیں اور بہت سے ورکرز سے لیکر رہنماؤں کو پاکستانی فورسز نے اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گئے ہیں جن میں سابقہ چیئرمین زاھد جان، وائس چیئرمین ذاکر جان، مرکزی سیکریٹری جنرل ثناءاللہ، انفارمیشن سیکریٹری شبیر بلوچ، حسام بلوچ، نصیر بلوچ سمیت سینکڑوں کارکنوں کو پاکستانی فورسز نے اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گئے ہیں جو تا حال زندانوں میں اذیت سہہ رہے ہیں۔ یہ ایک الگ بحث ہے، لیکن آج میں صرف شبیر جان کے بارے میں کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں تا کہ دنیا کے ہر کونے میں یہ پیغام پہنچا سکوں کہ بلوچستان پر ریاست پاکستان نے غیر انسانی عمل کے تمام حدود پار کر چکا ہے۔ شبیر جان کا تعلق آواران لباچ سے ہے، آواران کو بلوچ تحریک آزادی کا مرکز کہا جاتا ہے'' اس وقت ہزاروں کے حساب سے پاکستانی فوجی کارندے اس چھوٹے سے علاقے میں موجود ہیں۔ شاید سوشل میڈیا کی مدد سے آپ لوگ دیکھ رہے ہیں، آواران میں فوج کی مظالم انتہا کو ہیں'' شبیر بلوچ کا تعلق پرامن جمہوری تنظیم بی ایس او آزاد سے ہے، شبیر بلوچ کو جس وقت اغوا کیا گیا تھا، اُس وقت وہ بی ایس او آزاد کا انفارمیشن سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ بی ایس او کو پاکستانی فوج نے 2013 کو کالعدم قرار دیا تھا، اُس پر ہر طرح کے پابندی لگایا گیا۔ لیکن بی ایس او کے کارکنوں نے شعوری کاروان کو روکنے نہیں دیا، بلکہ جدوجہد میں مصروفِ عمل رہے اور یہ جدوجہد تا حال جاری ہے۔ نوجوان طبقے کی ذہنی تربیت، شعوری آبیاری، جدید سائنسی طرزِ علم سے لیس کرنے کی تگ دو میں ہے۔ بی ایس او کے خواب میں ایک پُرامن آزاد خودمختار وطن ہے، بلوچستان کو آزاد کروا کے ہر چیز کا فیصلہ بلوچ قوم کے ہاتھ میں دینا ہے۔ اسی خواب کو عملی جامہ

پہنانے کیلئے بلوچ نوجوان طبقہ جدوجہد کررہے ہیں، ریاست نے بی ایس او کو اسی پاداش میں کالعدم قرار دیا۔ ویسے آزادی دنیا کے ہر قوم کا بنیادی حق ہے، جسے دنیا کا ہر قانون تسلیم کرتا ہے کہ ہر قوم اپنے آزاد وطن کا مالک رہے، اسی لیئے یہ آزادی بلوچوں کا بنیادی حق ہے، اس کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ شبیر ایک آزادی پسند باشعور طالب علم ہے، اگر بلوچستان کی تاریخی پس منظر کو مدِ نظر رکھا جائے، تاریخی حوالے سے دیکھ لیں تو بلوچستان پاکستان کا کبھی بھی حصہ نہیں رہا ہے، پاکستانی باشندوں کا کلچر، تہذیب، بودوباش، بلوچ قوم سے بلکل باقی پاکستانیوں سے الگ ہیں بلوچ کا پنجابی سے کوئی مشابہت نہیں۔ پاکستان نے 27 مارچ 1948ء کو بہ زور شمشیر بلوچستان پر قبضہ کیا لیکن بلوچ قوم شروع سے پاکستانی قبضے کے خلاف جدوجہد کررہی ہے۔ بلوچ ریاست پاکستان کے خلاف پہلے دن سے اعلانِ جنگ کیئے ہوئے ہیں، یہ جنگ ساٹھ اور ستر کے دہائی سے ہوتے ہوئے موجودہ جنگ تک آ پہنچی ہے۔ جنگ کی ہیت نے 2000ء میں ایک جدید روپ دہار لیا، قدرے شدت کے ساتھ رونما ہوا، اس متحرک تحریک میں نوجوان، بزرگ، بچے، عورت شامل ہوئے۔ لیکن نوجوان زیادہ سے زیادہ اس جہد میں مصروف رہے۔ ویسے اکثر اوقات نوجوان طبقہ تبدیلی لانے میں سرِ فہرست رہے۔ شبیر بھی اُن نوجوانوں میں سے ایک ہے، جو تبدیلی کیلئے ہر مصیبت کا سامنے کرتے ہوئے آج زندان میں بند اذیتیں سہہ رہا ہے۔ مگر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شبیر بلوچ اذیت برداشت کررہا ہے، وہ اچھے مستقبل کے لیئے آزاد خودمختار وطن کیلئے سب کچھ قربان کررہا ہے۔ جب وہ بی ایس او آزاد جیسے تنظیم کا رکن منتخب ہوا، انہوں نے اُسی دن فیصلہ کیا ہوگا کہ ہمیں ہر طرح کے تکلیف کو برداشت کرنا پڑے گا، مجھے زندانوں میں بند کیا جائے گا یا مجھے شہید کیا جاسکتا ہے۔ شبیر جان کے بارے میں عزت لکھتے ہیں کہ شبیر نے ایک بار کہا تھا کہ میں اپنے ہی حق کیلئے کیوں نامروں، حق بھی میرا زندگی بھی میرا، میرا حق ہے کہ بغیر کسی مسئلے کے مجھے مل جائے، اس بات سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ اپنے حق و وطن سے کتنا محبت کرتا ہے اور اس بات کا تصدیق کررہا ہے کہ میرا وطن ہے اس پر قبضہ کیا گیا ہے، قبضہ گیر کو ہمارے سرزمین سے نکلنا چاہیئے۔ 4 اکتوبر 2016 وہ دن ہے جس روز پاکستانی خفیہ اداروں اور پاکستانی آرمی کے اہلکاروں نے کیچ کے علاقے گورکوپ سے شبیر بلوچ سمیت بہت سے لوگوں اغوا کرکے اپنے ساتھ لے گئے، جو تا حال لاپتہ ہیں۔ شبیر جان کو دو سال مکمل ہوا ہے، شبیر جان کے بارے میں اب تک کوئی خبر نہیں شبیر جان کے لواحقین نے اسکے اغوا ہونے کے خلاف ہر پرامن احتجاج کیا۔ ہر ممکن کوشش کی گئی کہ شبیر جان کو منظرِ عام پر لایا جاسکے، اگر آزادی کا مطالبہ جرم ہے تو ہر بلوچ کی مطالبہ ہے، ہماری سرزمین سے پاکستان نکل جائے، یہ کوئی جرم نہیں ہے، شبیر بلوچ سمیت تمام نوجوان جو اغواء ہوئے ہیں، وہ جنگی قیدی ہیں انہیں جنگی قیدی تصور کریں۔ انکو عدالت میں پیش کریں، انہیں قوانین کے مطابق سزا دی جائے لیکن منظر عام پر لے آئے لیکن پاکستانی فوج نے انسانی حقوق کے پامالیوں کے تمام حدود پار کرچکی ہے، تمام انسان دوست اداروں سے اپیل ہے کہ لاپتہ شبیر جان کی رہائی میں اپنا کردار ادا کریں، شبیر جان کو بازیاب کروائیں۔

سیما مجھے معاف کرنا

سفر خان بلوچ

سوچ سوچ کر سر درد سے پھٹا جا رہا ہے نہ جانے آج کیا لکھوں؟ کس کی داستان لکھوں کیونکہ بلوچ سرزمین اور اس میں رہنے والے مظلوم عوام کی زندگی خود ایک داستان بن کر رہ گئی ہیں۔ ان ماوں کی داستان لکھوں جو اپنے بچوں کے انتظار کرتے کرتے دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں یا ان بہنوں کی داستان لکھوں جو اپنے بھائیوں کی بازیابی کے لئے کبھی کراچی، کبھی کوئٹہ اور کبھی اسلام آباد کی سڑکوں میں احتجاج کرتی نظر آتی ہیں۔ نہ جانے کیا لکھوں کس سے شکوہ کرو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ ذہن میں خیالات آتے رہے اور بدلتے رہے اور اب یہ فیصلہ کیا کہ بلوچستان میں جبری گمشدگی کا مسئلہ ایک ایسا انسانی مسئلہ ہے جس نے پورے بلوچ سماج کو متاثر کیا ہے آج بھی بلوچستان میں سینکڑوں افراد لاپتہ ہیں اور انکی بازیابی کے لئے انکے اہلخانہ سراپا احتجاج ہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ بہنیں جن کے بھائی صیح سلامت اپنے گھروں کو پہنچ گئے لیکن اب بھی ایسی بہنیں یا بیٹیاں اپنے بھائی اور والد کے انتظار میں غم و تکالیف برداشت کر رہی ہیں ماما قدیر کے سامنے پڑی مسنگ پرسنز کی فہرست میں ہر روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور وہ آج بھی مسنگ فرسنز کے کیمپ میں اس امید میں بیٹھے ہے کہ شاہد میرے سامنے پڑی مسنگ پرسنز کی فہرست ایک دن مکمل خالی ہو اور سب مسنگ پرسنز صیح سلامت اپنے گھر واپس آ جائیں 180۔ سمی، مہلب، سیما اور فرزانہ مجید کی کئی سالوں سے انتظار بھری آنکھوں کی انتظار ختم ہو۔ ماما قدیر، سمی اور سیما کی کہانی کو اگر چھوڑ دیا جائے کیونکہ ان کی داستان تو دکھ و درد کا باب ہے یہ لفظوں میں بیان نہیں ہوسکتا اب اسی باب میں میرا وہ دوست بھی شامل کیا گیا جو سردیوں میں میرے ساتھ بستر بانٹ کر سوتا تھا اور آج نا جانے کس حال میں ہوگا؟ اور کس ٹارچر سیل میں بند ہوگا؟ زندہ ہے یا زندگی سے امر کیا گیا ہے؟ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ اسی سوچ کے تناظر میں کچھ لکھ نہیں پاتا ہوں ایک ایسے عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں جیسے کسی نے میرے ہاتھ پاوں باندھ کر ایک اسی جگہ پہ مجھے چھوڑ دیا ہوں جہاں چاروں طرف اندھیرا ہے نہ میں کچھ دیکھ سکتا ہوں نہ کچھ بول سکتا ہوں۔ آخر میں ہاتھ اوپر کر کے بس خدا کے پاس یہیں دعا کر سکتا ہوں کہ خدا مجھے اتنی توفیق دے کہ میں اپنے ہمبل کے یاد میں کچھ یاداشتیں بیان کر سکو۔ میں اسی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ اس منتظر سیما کی داستان اپنے قلم کے نوک سے لکھ ہی ڈالوں۔ پھر میں نے سوچا کیا لکھوں اس کے بارے میں جو اکیلی انجان شہروں میں انصاف کی خاطر در پہ در کی ٹوکرے کا رہی ہے اجنبی لوگوں کے درمیان اپنے بھائی کو تلاش تھی ہوئی اپنی دکھ کی داستان بو رہی ہے اسے دیکھ کر مجھ پر یہ طاری ہوتا ہے کہ وہ مجھے پکار رہی ہے!!! کہ آ میری آواز بن۔!!!۔ زندگی بھی عجب کارستانیاں دکھاتا ہے کسی کو کچھ مانگے بنا ملتا ہے اور کوئی اپنے پیاروں کو دیکھنے کے لیے دنیا کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے لیکن وہ اسے اس انسانی دنیا میں نہیں پاتا اور وہ بچپن کی اُس کی یادوں کے تجسس، احساس، محبت میں مبتلا کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ سیما اور شبیر کی کہانی بھی کچھ ایسی ہے کہ ایک جوان سالہ بھائی کو ریاست اٹھا کے لے گیا اور اس کے بعد سارے دنیا کو ایک ایک کرنے، انصاف کے ہر ایک ادارے کی چوکٹ میں پہنچ جانے کے بعد بھی انصاف کی دیوی اس بہن سے روٹھی رہی۔ قلم بھی عجب شئے ہے جو انسان کے احساس کو جگاتی ہے لیکن کبھی بھی احساس کی ترجمانی نہیں کرتی اور احساس بھی عجب ہے جو انسان کو رلاتا ہیے، رنجیدہ کرتا ہے لیکن قلم کی نوک پر کبھی نہیں آتا پھر بھی میں لکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ اپنے غلام دیس کے غلام فرزندوں کی دردناک اور ہولناک داستان بیان کر سکوں اور اس کوشش میں شائد میرا آواز بلوچ کے مجموعی قومی آواز کا حصہ بن جائے اور دنیا ہماری دکھ، و درد کو سمجھ کر کم از کم ہماری خلاقی مدد کریں تا کہ بلوچ فرزندوں کو عفریت کی طرح نگلنے والے پاکستان کے نیش کند ہوسکیں، وہ ناکام ہو جائے اور انسانیت کا بول بالا ہو جائے۔

آٹھ جون بلوچ مسنگ پرسنز ڈے

شوہاز بلوچ

بلوچ قومی تحریک میں بی ایس او کا کردار کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے بلکہ بقول چیئرمین زاہد ''اگر بی ایس او قومی تحریک میں اپنا مثالی کردار ادا نہ کرتا تو آج یہ بلوچ جدوجہد اس نہج تک نہ پہنچتا'' آج یہ بی ایس او کے دوستوں اور کامریڈوں کی مثالی کردار ہے جس نے قومی تحریک کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں سے دشمن کا شکست واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے اور جلد یا بدیر پاکستانی فوج بلوچستان سے نکلنے والا ہے بی ایس او نے اپنے سفر میں کافی نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ تنظیم کے کارکنان سمیت کئی مرکزی کامریڈ شہید کئے جا چکے ہیں، جن میں رضا جہانگیر، کامریڈ قیوم، رسول جان، کمال بلوچ، قاضی شاکر، سراج اور کئی دوسرے شہید شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تنظیم کے سو سے زائد کامریڈ پاکستانی ٹارچر سیلوں میں قید و بند مختلف ریاستی اذیتوں کا سامنے کر رہے ہیں جس میں تنظیم کے سابقہ مرکزی چیئرمین زاہد بلوچ سابقہ وائس چیئرمین ذاکر مجید بلوچ تنظیم کے مرکزی جنرل سیکرٹری عزت بلوچ، سینٹرل انفارمیشن سیکرٹری شبیر بلوچ، مرکزی کمیٹی کے ممبران حسام بلوچ اور نصیر احمد سمیت کئی دوسرے کارکنان شامل ہیں جو مختلف جگہوں سے ریاستی اداروں کے اہلکاروں نے لاپتہ کر دیے ہیں جن کا ابھی تک تنظیم یا اُن کے گھروں والوں کو کوئی علم نہیں ہے ایک طلباء تنظیم پر اتنی جارحیت شاید ہی کہیں دنیا میں دیکھنے کو ملتا ہو بلکہ جہاں سے میرا اپنا مطالعہ اور دوستوں سے لئے گئے معلومات ہیں، دنیا میں ایسا کوئی بھی طلباء تنظیم نہیں ہے جس کے سو سے زائد ممبران غائب و شہید کئے جا چکے ہیں اور وہ تنظیم اپنا وجود برقرار رکھ پایا ہے یقیناً یہ کریڈٹ تنظیم کے لیڈرشپ سمیت سب کامریڈوں کو جاتا ہے جنہوں نے ان سخت حالات کا بہادری و دلیری سے مقابلہ کیا ہے اور دشمن سے ابھی تک نبرد آزما ہیں اور قلم و کتاب کا کاروان لئے بلوچستان و بلوچستان سے باہر دنیا کے ہر کونے میں بلوچ نوجوانوں کو یکجا کر رہے ہیں و اُن کی تربیت کر رہے ہیں اور قومی آجوئی کا پیغام لئے گھر گھر جا کر قوم کو آگاہی دے رہے ہیں۔ جب بلوچ قومی تحریک 2000 میں ایک بار پھر اُبھر کر سامنے آیا تو اس مرتبہ یہ تحریک پچھلے تحریکوں سے مختلف تھا کیونکہ یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ جنگ ایک قبائلی سردار سے نکل کر عام عوام تک پہنچ گیا تھا، جہاں کثیر تعداد میں نوجوان اس جدوجہد سے وابستہ ہو گئے تھے جو اپنا ایک نظریہ لیے ہوئے اس کاروان میں شامل ہو گئے تھے ہر کوئی قومی آزادی کا جذبہ لیے ہوئے دشمن کے خلاف کھڑا ہو رہا تھا پہلے پہل دشمن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ جدوجہد پہلے تحریکوں سے مختلف ہے لیکن جوق در جوق نوجوانوں کی شمولیت دیکھ کر دشمن ڈر محسوس کرنے لگا پھر کیا وہی ہوا جس کا ہر باشعور نوجوانوں کو پہلے ادراک تھا کہ دشمن تحریک کو کچلنے اور غلامی کو دوام بخشنے کیلئے مختلف حربے و ہتھکنڈے استعمال میں لائے گا جس کا باقاعدہ آغاز 2005 میں کراچی سے بلوچ رہنماؤں کی گرفتاری تھی، جہاں سے بی ایس او آزاد کے بانی ڈاکٹر اللہ نظر بلوچ، اُس وقت کے بی ایس او آزاد کے مرکزی انفارمیشن سیکرٹری ڈاکٹر مراد بلوچ، ڈاکٹر اللہ نظر کے چھوٹے بھائی شہید علی نواز گوہر بلوچ اور کچھ دوسرے دوستوں کو لاپتہ کیا گیا پھر اُنہیں مختلف اذیتیں دی گئیں، کئی وقت تک اُنہیں ٹارچر سیلوں میں قید کیا پھر ایک ایک کر کے اُنہیں بازیاب کیا گیا لیکن ان دوستوں کی بازیابی اُس وقت عمل میں لائی گئی جب پورے بلوچ قوم نے اُن کی جبری گمشدگی کے خلاف مظاہرے و احتجاج کیا لیکن وہیں سے بلوچوں کی جبری گمشدگی کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو تا ہنوز جاری و ساری ہے، اُن کی رہائی کے بعد ریاستی قابض فوج و خفیہ اداروں نے لاپتہ کرنے کا سلسلہ مزید تیز کر دیا پھر چلتے چلتے 2009 میں اس میں کافی تیزی دیکھنے کو ملی، کوئی باشعور نوجوان قومی آجوئی

کی بات کرتا اُنہیں دوسرے دن فوج وخفیہ اداروں کے اہلکار اغوا کرتے اس طرح روز بروز یہ سلسلہ شدت پکڑتا گیا اس دوران بی ایس او آزاد کے کارکنان ولیڈر پاکستانی فوج کے سب سے زیادہ نشانے پر تھے اور ایک منصوبے کے تحت بی ایس او کے لیڈروں کو ٹارگٹ کیا جارہا تھا تاکہ بلوچ نوجوانوں کو قلم وکتاب سے دور رکھا جائیں اگر بلوچ نوجوان علم وتعلیم سے دور رہیں گے تو اُنہیں ہم جلدی اپنے جھوٹ وفریب سے دھوکا دے سکیں گے لیکن دشمن کو بھی پتا تھا کہ جب تک بی ایس او آزاد کا ایک بھی کامریڈ زندہ وسلامت ہے دشمن کا یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہو پائے گا۔اس لیے دشمن نے بی ایس او آزاد کے مرکزی سینئر وائس چیئرمین ذاکر مجید کو 8 جون 2009 کو اغواہ کیا، ذاکر مجید کو پہلے بھی ایک مرتبہ لاپتہ کیا گیا تھا، مختلف اذیتیں دینے کے بعد اُنہیں رہائی دی گئی تھی، ذاکر کی اغواہ نما گرفتاری کے خلاف تنظیم نے کئی احتجاجی مظاہرے کئے۔عالمی انسانی حقوق کے اداروں کے پاس ذاکر کا کیس پہنچایا لیکن دشمن اس مرتبہ اپنی بربریت پر اُتر آیا تھا۔ذاکر کو بازیاب کرنے کے بجائے تنظیم کے دیگر دوستوں کو لاپتہ کرنا شروع کردیا ذاکر مجید کی بازیابی کے لئے ذاکر کی بہن فرزانہ مجید نے کوئٹہ سے کراچی اور پھر کراچی سے کوئٹہ دیگر متاثرین کے ساتھ ایک تاریخی لانگ مارچ کیا لیکن فرزانہ مجید کو بھی کچھ ہاتھ نہیں آیا۔کیونکہ ریاست واُن کے متعلقہ ادارے مکمل خوفزدہ تھے کہ اگر ذاکر مجید رہا ہوئے تو وہ پھر اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھے گا، سنگت ذاکر تو رہا نہیں ہو پایا لیکن دشمن نے جبری گمشدگی میں کافی تیزی لائی آج بلوچستان میں ایسا ایک بھی گھر نہیں ملے گا سوائے ریاستی چمچوں ودلالوں کے جہاں سے کوئی لاپتہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ بلوچستان میں ایسے گھر بھی کافی تعداد میں جہاں پوری خاندان کے سارے لوگ لاپتہ ہیں سوائے عورتوں کے، لیکن اب باز جگہوں میں عورتیں بھی کافی تعداد میں لاپتہ ہوئیں ہیں کچھ مہینے پہلے آواران سے کئی عورت وبچے لاپتہ کردیے گئے تھے جنہیں تشدد ے بعد رہا کیا گیا لیکن مشکئے میں اب تک کی کئی خواتین اور بچے فوج کے حراست میں ہیں۔بلوچستان میں لاپتہ ہونا اب ایک عام بات بن چُکا ہے آئے دن کئی لوگ لاپتہ ہوتے ہیں جن میں کچھ کی مسخ شدہ لاشیں برآمد ہوتی ہیں کچھ سالوں سال ریاستوں عقوبت خانوں میں اذیتیں سہہ کر واپس لوٹ آتے ہیں، البتہ لوٹ آنے کے بعد زیادہ تر ذہنی امراض میں مبتلا ہوتی ہیں اور کچھ برسوں بعد بھی لوٹ کر نہیں آتے جن کے گھر والے پھر اُن کے واپس آنے کی اُمیدیں چھوڑ دیتے ہیں۔بلوچستان میں جبری گمشدگی کے خلاف مسنگ پرسنز کا ایک کیمپ بھی موجود ہے جو نو سال سے جاری ہے جیسے بزرگ ماما قدیر چلا رہے ہیں جن کا بیٹا جلیل ریکی پاکستانی فوج کے ہاتھوں لاپتہ ہونے کے بعد مسخ شدہ لاش کی شکل میں ماما کو واپس ملی تھیں جنہیں مختلف اذیتیں دے کر شہید کیا گیا تھا اس کیمپ کا مقصد بلوچ مسنگ پرسنز کی رہائی ہے جنہیں پاکستانی فوج وخفیہ ادارے زبردستی لاپتہ کرچکے ہیں لیکن آج تک ماما قدیر سمیت ہر مسنگ افراد کے لواحقین کو پاکستانی وعالمی اداروں سے انصاف نہیں ملا ہے، دنیا میں عالمی اداروں کی جانب سے گمشدگی کے خلاف کئی قوانین موجود ہیں جبکہ دنیا کے اندر کسی انسان کو بلاوجہ لاپتہ کرنا انسانی جرم مانا جاتا ہے۔بلوچ قومی تحریک میں گمشدگی کا مسئلہ ایک سنگین گھمبیر مسئلہ ہے جس کا ادراک رکھتے ہوئے پچھلے سال بی ایس او آزاد کی لیڈرشپ کی جانب سے یہ فیصلہ لیا گیا کہ بلوچ قوم اپنے لاپتہ افراد کا ایک قومی دن مقرر کرے گا جیسے کہ 8 جون یعنی بلوچ قومی رہنما وبی ایس او آزاد کے سابقہ مرکزی وائس چیئرمین زاکر مجید کی گمشدگی کا دن ہے اس لیے اس دن کو بطور بلوچ لاپتہ افراد کا دن منایا جائیں، اس فیصلہ کا بلوچستان میں سب سے بڑی آزادی پسند جماعت بی این ایم نے خیر مقدم کیا تھا اور اس دن کو باقاعدہ بلوچ مسنگ پرسنز ڈے کے طور ہر منانے کا اعلان کیا تھا پچھلے سال سے اس دن کو بلوچ قوم بلوچ مسنگ پرسنز ڈے کے طور پر مناتا آیا ہے یہ ایک تاریخی فیصلہ ہے جس کا ہر ذی شعور انسان خیر مقدم کرے گا لاپتہ افراد کیلئے ایک دن کا مقرر کرنا عین وقت کی ضرورت تھی تاکہ ہم اپنے تنظیمی دوستوں کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں جبری لاپتہ ہوئے ہر بلوچ کی جبری گمشدگی کے خلاف آواز بلند کریں۔

آؤ شبیر مکالمہ کرتے ہیں

توارش بلوچ

شبیر سمجھ نہیں آ رہا کہ کہاں سے شروع کروں؟

کیونکہ آپ کے جانے کے بعد دشمن فوج نے بلوچستان کے ہر علاقے میں مزید وحشت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مزید لوگوں کو علاقوں سے در بدر کر کے مختلف شہروں میں در بدر کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا ہے۔ مزید لوگوں کی لاشیں ملی ہیں مزید دوست اغوا ہوئے ہیں۔ میں زندان میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا لیکن چونکہ مجھے پتہ ہے آپ بہت بہادر اور نڈر ہو، اس لیے باتوں کو سہنے کی ہمت و جرات رکھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ آپ کے جانے کے بعد بی ایس او کو چند اور جھٹکے لگے، وہ یہ کہ عزت جان، حسام جان اور چراگ جان کو دشمن فوج نے 15 نومبر 2017 کی رات کراچی سے چراگ جان کے گھر سنگت رفیق کے ساتھ لاپتہ کیا۔ مہرنگ (چراگِ کستریں جنک) نے فوجیوں کے پاؤں پکڑے کہ ہمارے ابو کو چھوڑ دو لیکن آپ کو تو ان ظالموں کا پتہ ہے ناں یہ کہاں کسی بچے کی گڑگڑاہٹ پر اپنی درندگی بند کر سکتے ہیں۔ انہوں نے تو دس سال کے چاکر جان کو بھی نہیں بخشا۔ ان ظالموں نے مہرنگ کو لات مار کر زخمی کر دیا اور سب کو اپنے ساتھ لے گئے، شاید یہ بات آپ کو بہت اذیت پہنچائیں لیکن پڑھنا چھوڑو مت آگے بھی بہت خبریں ہیں جو شاید آپ کو مزید اذیت دیں لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ سہہ لینگے قاضی جان کے چلے جانے کا شاید آپ کو پتہ چل گیا ہوگا جو آپ کی اغواء کے ایک دن بعد کولواہ میں فوج نے دوران آپریشن میں سب لوگوں کے سامنے گولیوں سے چلنی کر دیا، اُنہیں آج دو سال پورا ہونے کو ہیں کہ وہ ہم سے بچھڑ گیا ہے۔ اسی کولواہ میں ہمارے کچھ اور مجید جان، دوست شاکر شاد اور صادق جان فوج کے ہاتھوں شہید ہو گئے اور اب کولواہ وہ نہیں جو پہلے تھا جہاں کولواہ ڈاک کا نظارہ کرتے کرتے راتیں بیت جاتیں، اب دشمن نے کولواہ کو بھی مکمل گھیر لیا ہے اور وہاں اپنے چوکیاں قائم کر چکا ہے۔ یہ وہی کولواہ ہے جہاں تو اور چراگ ایک ساتھ ہر جگہ گھوم چکے ہو مجھے پتا ہے آپ بھولے نہیں ہوان لمحوں کو سب آپ کو یاد ہیں۔ ایک اور بری خبر دوں کہ بندوک (سراج ساوڈ) بھی پاکستانی درندگی کا شکار ہو گیا اور وہ بھی ہم سے جسمانی حوالے سے جدا ہو گیا ہے بندوک کو بھی درندہ فوج نے گرفتار کرنے کے بعد فائرنگ کر کے شہید کر دیا اب وہ آواران نہیں رہا جہاں رضا جہانگیر اور آپ گلیوں میں سرے عام لوگوں سے ملاقات کرتے تھے۔ اُنہیں قومی جدوجہد کے بارے میں آگاہی فراہم کرتے تھے۔ اب آواران کے چپے چپے پر دشمن فوج نے خوف میں مبتلا ہو کر مورچے قائم کر لیے ہیں تاکہ لوگوں کے اندر اُن کا خوف پیدا ہو اور پھر سے کوئی شبیر اور رضا نہ بن جائیں۔ ایک مزید بری خبر ہے گنجل بیچاری اب اس دنیا میں نہیں رہی آپ کو تو پتا ہے وہ پہلے سے ہی اپنے خاوند کی گمشدگی پر پریشان اور درد میں مبتلا تھی آپ کے دیے گئے نصیحتوں پر وہ اپنی پریشان زندگی کو جی رہی تھی لیکن اب اُنہیں کون سہارہ دیتا آپ کے جانے کے بعد پھر وہ ان ظلموں کو مزید برداشت نہیں کر پائی اور اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی۔ آپ سوچ رہے ہونگے کہ میں صبح سے ہی آپ کو بری خبریں دے رہا ہوں چلو کی جان! اب کچھ اچھی باتیں کر لیتے ہیں سب سے پہلے آپ کو یہ مبارک بات دیتا چلوں کہ بی ایس او آزاد کئی نشیب و فراز اتار چڑھاؤ اور مشکل و مصائب کے بعد اپنا اکیسواں قومی کونسل سیشن بیادِ

مرکزی جنرل سیکرٹری عزت بلوچ ومرکزی انفارمیشن سیکرٹری لکمیر بلوچ بنام بلوچ اسیران منعقد کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ بانک کریمہ اور چیئرمین کمال کا سفر ختم ہوا اور سہراب بلوچ مرکزی چیئرمین اور شاہ میر بلوچ مرکزی جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے شاید یہ دنوں نام آپ کیلئے انجام ہوں لیکن معاف کرنا دوست تنظیمی رازداری کا خیال بھی رکھنا ہے اور اسے آپ کے علاوہ دشمن بھی پڑھے گا۔اس لیے دوستوں کے ناموں کا خلاصہ نہیں کرسکتا ، مجھے معلوم ہے کہ آپ ناراض نہیں ہونگے کیونکہ آپ کو پتہ ہے ہمارے یہاں رازداری کتنی معنی رکھتی ہے ایک اور خوش خبری یہ ہے کہ تنظیم پہلے سے اب زیادہ منظّم ہوچکی ہے اب سارے دوست کتابیں پڑھتے ہیں اب ہر کوئی دوسرے کو کتاب پڑھنے کیلئے دیتا ہے آپ ہمیشہ کہتے تھے ناں کہ بی ایس او کا اگر کوئی ممبر دس کتابیں نہ پڑھا ہو وہ بی ایس او کے ممبرشپ کا لائق نہیں اب تنظیم کے سارے ممبران باقاعدگی سے اچھی عالمی کتابوں کا مطالعہ کررہے ہیں اور باقی رازداری کا بھی بہت اچھے سے خیال داری کررہے ہیں اب تنظیم کے خلاف میڈیا میں پروپگنڈا ابھی بند ہوچکا ہے بی ایس او اپنی جدوجہد کی بدولت آج ہر بلوچ نوجوان تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔شاید آپ سوچ رہے ہونگے کہ شروع سے اب تک بس بی ایس او کے حوالے گفتگو کررہا ہوں جبکہ بلوچستان کے حالات قومی جدوجہد اور عالمی دنیا کا بلوچ تحریک کے حوالے سے موقف پر تو بات نہیں کررہا خیر آؤ کچھ سیاسی حالات کا مختصر اجائزہ لیتے ہیں یار کیا کروں آپ کو تو معلوم ہے میں بہت ہی باتونی ہوں جب کسی موضوع پر گفتگو شروع کرتا ہوں تو دوسرے چیزوں کا خیال ہی نہیں رکھتا خیر بات بلوچستان سے شروع کرتے ہیں۔۔۔الیکشن سے کچھ مہینے پہلے ایک مختصر مدت کیلئے پاکستانی فوج نے جھاؤ سے بلوچ قاتل اور آواران میں بلوچ دشمن خاندان سے قدوس بزنجو کو وزیراعلی کے منصف پر براجمان کیا۔اس کا مقصد تھا کہ اس عمل سے میں آواران کے لوگوں کا دل جیت لوں گا لیکن آواران کے لوگوں کی تربیت تو آپ جیسے دوستوں نے کی ہے یہاں فوج کا حربہ کیسے کامیاب ہوپاتا؟

شاید آپ کو معلوم بھی نہیں کہ پاکستان میں نام نہاد الیکشن ایک بار پھر ہوکر ختم ہوئے ہیں خیر میں بھی کیا سوچ رہا ہوں آپ کو کیسے معلوم ہوگا آپ تو زندان میں ہیں اور وہاں میں نے سُنا ہے کہ ایک کالی کوٹھڑی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔یہاں تک کہ تقاضائے حاجات کیلئے بھی انسان کو دو دو تین تین دن تک جانے نہیں دیا جاتا، کھانا بھی میسر نہیں ہوتا، ساری ساری رات سر نیچے اور پاؤں اُپر کرکے لٹکایا جاتا ہے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ جب مجھے لاپتہ کیا گیا تھا تو پہلے ساتھ دنوں تک مجھے الٹا لٹکایا گیا تھا بس دن میں ایک مرتبہ کھانے کے وقت نیچے اتار دیا جاتا تھا اُس کے مطابق جب مجھے نیچے اتار دیا گیا میں نے پورے دو مہینے تک زمین کو الٹا پایا، سوری یار میں کہاں سے کہاں چلا گیا میں بات کررہا تھا پاکستانی انتخابات کی پاکستان انتخابات 25 جولائی 2018 کو منعقد ہوئے اس مرتبہ فوج نے کھلی دھاندلی کرتے ہوئے اپنے چہیتے عمران خان کو آگے لاتے ہوئے اُس کے پارٹی کو جتوایا لیکن اس مرتبہ فوج کی انتخابات کی دھاندلی کے متعلق پوری دنیا آگاہ ہوئی، نواز شریف کو الیکشن سے پہلے ہی فوج سے اختلافات کی وجہ سے جیل میں ڈالا گیا۔بلوچستان میں پوری آئی ایس آئی والوں نے ایک ہوکر اپنی ایک جماعت (بلوچستان عوامی پارٹی) بنائی، نیشنل پارٹی کے جتنے بھی آئی ایس آئی کے چہیتے تھے، وہ باپ میں شامل ہوگئے اور جس جس نے نواز شریف کا ساتھ دینا کا فیصلہ کیا اُنہیں فوج نے دیوار سے لگا کر بری طرح الیکشن سے ہروادیا۔باقی جیت تو پہلے سے ہی پکی تھی کہ جس پارٹی کو راتوں رات آئی ایس آئی نے الیکشن سے پہلے بنادیا تو لازماً انہی کو ہی جتوانا تھی اور بلوچستان نیشنل پارٹی مینگل جس نے کچھ ووٹ حاصل کی کو فوج نے کچھ نشستیں دے کر منہ بند کردیا اور اختر مینگل نیشنل اسمبلی میں سیٹ

ملنے پر خوش ہوئے اور بلوچستان میں اکثریت ووٹ ملنے کے باوجود بھی اپوزیشن میں بیٹھے پر اکتفا کیا، کیا کرتا بیچارہ فوج کے سامنے تو یہ سارے بے بس ہیں الیکشن میں دلچسپ بات یہ تھی کہ پاکستانی فوج نے اپنی پوری طاقت کا مظاہرہ کیا کہ بلوچ قوم الیکشن میں حصہ لیں لالچ، دھمکی یہاں تک قتل اور اغوا کرنے کی دھمکی دینے کے بعد بھی عوام کا الیکشن میں وابستگی صفر بٹا صفر تھی جتنے بھی لوگوں نے ووٹ کاسٹ کیا، وہ سب دلالوں اور سرداروں کے اپنے خاندان والے ودھمکائے گئے، لوگ تھے جبکہ عام عوام نے ایک مرتبہ پھر الیکشن میں حصہ نہ لے کر آزادی کے حق میں ووٹ دیا۔ پاکستانی حالات پہلے سے بہت زیادہ خراب ہو چکے ہیں پاکستانی معیشت اتنی گر چکی ہے کہ اب دنیا کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے معاشی حالات اتنے برے ہیں کہ بیچارہ عمران خان جو پچھلے 22 سالوں سے وزارت اعظمی کیلئے تڑپ رہے ہیں کہ یہاں عزت ملے گی کو پہلے ہی دن ہاتھ پھیلانے پر مجبور کیا اور ایک ڈیم بنانے کیلئے عمران خان چندہ مانگ رہے ہیں (مجھے یقین ہے کہ آپ یہ پڑھ کر بہت ہنسیں گے لیکن خیال کرنا جابر فوجیاں تیری آواز نہ سنیں وگرنہ پھر ہمارا مقالمہ نہیں ہو پائے گا) اب امریکہ نے بھی پاکستان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے گرے لسٹ میں پاکستان کا نام آ چکا ہے قوی امکان ہے کہ پاکستان جلد ہی بلیک لسٹ میں شامل ہو جائے گا۔ افغانستان میں پچھلے دو عرصوں سے جو دہشت گردی پاکستان پھیلا رہی ہے کو دنیا اب اچھی طرح جان چکی ہے جبکہ پوری دنیا میں پاکستان تنہا ہوتی جا رہی ہے امریکہ کا ڈومور کا مطالبہ پاکستانی فوج کو پریشان کر چکی ہے جبکہ دوسری جانب اُس کے پالے ہوئے دہشت گرد بھی بے مالی کی وجہ پاکستان سے تنگ آنے لگے ہیں، اب پاکستان انڈیا کے سامنے بھی بے بس دیکھائی دے رہا ہے، نئی حکومت بنتے ہی انہیں نے انڈیا سے مزاکرات کی بات شروع کی ہے لیکن اب دہلی اس مرتبہ اسلام آباد کی چالوں میں نہیں آنے والی کیونکہ بھارت جانتا ہے کہ جب بھی پاکستان کو موقع ملا بھارت پر ٹوٹ پڑے گا ابھی مصیبت میں ہے، اس لیے مزاکرات کی بات کر رہا ہے۔ لکی پاکستان کی بربادی کے قصوں کو بیان کرنا شروع کروں تو صبح ہو جائے گی اور باتیں بھی بہت ہیں اس لیے پاکستان کو چھوڑ کر اب بلوچ جدوجہد پر آتے ہیں یہاں بھی میں پہلے آپ کو کچھ ناخوشگوار خبریں سناؤں گا بی ایل اے ایک مرتبہ پھر تقسیم ہو چکا ہے اُستاد اسلم اور چیئرمین بشیر زیب اکثریتی ساتھیوں کے ساتھ بی ایل اے کے جیئند بلوچ ترجمان کے نام سے مسلح کارروائیاں کر رہی ہیں جبکہ سردار لندن والوں کے ساتھ اکتفا کر بیٹھا ہے جبکہ دونوں بی ایل اے کے اصل دعویدار ہونے کی باتیں کر رہے ہیں لیکن عملاً کارروائی جتنے بھی ہو رہے ہیں وہ بی ایل اے جیئند قبول کر رہا ہے، بی ایل اے کے فدائی سنگت ریحان (جان اُستاد اسلم کا بڑے بیٹے) نے چینی انجینئرنوں پر دالبندین کے مقام پر خودکش حملہ کیا، جس سے کئی چینی انجینئر مارے گئے اور متعدد زخمی ہو گئے، ریحان جان نے خودکش حملہ کر کے جہد میں ایک نئی روح پھونک دی اس کے علاوہ بی ایل ایف اور بی آر اے کے درمیان بھی کچھ اختلافات میڈیا میں سامنے آئے جہاں ایک دوسرے کے خلاف بیان جاری کئے گئے لیکن معاملہ پھر جلدی سلجھ گیا اور مزید میڈیا کا سہارہ نہیں لیا گیا، چلو کچھ خوش خبریاں بھی دیتا چلوں بی ایل ایف اور بی ایل اے کے درمیان ایک مضبوط اتحاد قائم ہو چکا ہے، دونوں تنظیمیں کئی مشترکہ کارروائیاں سرانجام دے چکی ہیں بی آر اے، یو بی اے، اور لشکر بلوچستان کے درمیان بھی ایک اتحاد قائم ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بی این ایم ایک قومی پارٹی کی حیثیت سے عوام کے بھروسوں پر اتر کر روز بروز بہتری کی جانب جا رہا ہے بلوچستان میں سیاسی اسپیس نہ ہونے کے باوجود بی این ایم کے مخلص کارکناں بلوچستان کے گوشے گوشے میں تنظیمی پروگرام کو پہنچا رہے ہیں جو تحریک کیلئے ایک نیک شگون ہے اس

مرتبہ کئی برسوں بعد بی ایس او بھی پارٹیوں کو لیڈر فراہم کرنے میں کامیاب ہو پایا ہے۔شبیر جان عالمی سطح پر بلوچ قومی تحریک کے بارے میں بھی کچھ بات کرتے ہیں عالمی دنیا اپنی غفلت میں آج بھی وہی پر ہے جو پہلے تھا بلوچ نوجوان سوشل ایکٹوسٹ ہیومن رائٹس کارکن وانسانی حقوق پر بات کرنے والے بلوچ تنظیمیں دن رات عالمی دنیا سے بلوچستان میں رونما ہونے والے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر ایکشن لینے کیلئے مانگ کرتے رہتے ہیں لیکن ہمیں ابھی تک کچھ بھی نظر نہیں آرہا کریمہ بلوچ نے اپنے ایک حالیہ گفتگو میں یو این او کے کردار کو ان الفاظوں میں بیان کیا تھا جو عالمی قوتوں یو این او اور دوسری انسانی حقوق کے تنظیمیں ہیں وہ شاید ہم سے زیادہ بے بس ہیں اگر نہیں ہوتا تو وہ آج بلوچستان سندھ اور پشتون کی آزادی کے نکتہ پر حمایت نہیں کرتا لیکن وہ بلوچستان میں رونما ہونے والے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور پاکستانی فوج کی بربریت پر آواز اٹھاتی اُس کو روکتی جو بلوچ لاپتہ افراد کا مسئلہ ہے جہاں ہمارے چھوٹے بچے 6 سال کے بچیاں لاپتہ ہوتے ہیں ان پر آواز اٹھاتی لیکن شاید وہ ہم سے زیادہ بے بس ہے ہم کسی سڑک کنارے ایک مظاہرہ کر سکتے ہیں یہ بھی نہیں کر سکتے ہیں ہمارے لیے وہ مظلوم اقوام کیلئے یہ بھی نہیں کر سکتی۔شبیر جان دل کہہ رہا ہے کہ آپ سے مزید بات کروں آپ کو دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں مزید معلومات فراہم کروں چین اور امریکہ کے درمیان ہونے والے تجارتی جنگ جو ایک خطرناک شکل اختیار کر چُکا ہے اس کے متعلق بریف کروں کیونکہ مجھے پتا ہے کہ آپ عالمی حالات کو جانا چاہتے ہیں افغانستان میں ہونے والے دنیا کی سب بڑی خون ریزی داعش کی موجودگی پاکستان کے ٹریننگ شدہ طالبانوں کی بے گناہ افغان شہریوں کی نسل کشی کے متعلق بھی آپ کو بتانا چاہتا ہوں کینیڈا اور سعودی عرب کے درمیان ہونے والے سفارتی تنازع بھی ایک سیر حاصل بحث ہے سعودی عرب سے یاد آیا کہ سی پیک میں سعودی عرب تیسرے پارٹنر کی حیثیت سے شامل ہو رہا ہے۔ترکی میں ہونے والے حالیہ انتخابات بھی بحث لائق ہے جہاں رجب طیب اردگان اور اُن کی سیاسی پارٹی جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی (اے کے پی) نے واضح برتری کے ساتھ انتخابات میں فتح حاصل کر لی ہے اس میں سب سے انوکھی بات یہ ہے کہ اب وہاں نیا نظام نافذ العمل ہو گیا ہے جس کے تحت صدر اردگان کو وہ طاقت واختیارات حاصل ہو گئے ہیں جو پہلے کسی بھی ترکی کے لیڈر کو حاصل نہیں تھے۔اسرائیل بھی فلسطین میں اپنی جاریت جاری رکھا ہوا ہے جہاں سے آئے روز فلسطینیوں کو قتل کیا جا رہا ہے ظلم و ناانصافی عروج پر ہے ہم بھی کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کیونکہ ہم خود اس ظلم جبر و ناانصافیوں کا کئی عرصے سے شکار ہیں مہاجرین کا مسل ؟ بھی ایک عالمی مسئلہ بن چُکا ہے ایک سال پہلے روینگیا میں بڑی تعداد میں مسلمان کا قتل عام ہوا جو وہاں سے نقل مقانی کر کے بنگلا دیش پہنچے جن کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ تھی مہاجرین سے یاد آیا کہ عمران خان نے کراچی میں ایک تازہ و پہلے دورے کے دوران یہ اعلان کیا تھا کہ مہاجرین کو شناختی کارڈ دیا جائے گا یعنی وہ یہاں کے باشندے ہونگے اس سے بلوچ زیادہ اقلیت میں ہوگا،ایران اور امریکہ کا جنگ بھی ایک بھیانک روپ دھار چکا ہے امریکہ نے ایران پر کئی پابندیاں عائد کی ہیں۔خیر شبیر جان مزید آگے نہیں بڑوں گا مجھے پتا ہے آپ تحریر پڑھنا چھوڑیں گے نہیں اور رات بھی کافی دیر ہو چکی ہے،اگر دشمن فوجیں دیر تک آپ کو جاگتا دیکھ لیں پھر آپ پر شک کرنے لگیں گے اس لیے آج خدا حافظ اگلی مرتبہ جب آپ سے مکالمہ کروں گا تو سب چیزوں کو اچھی طرح ڈسکس کرنے کی کوشش کروں گا۔۔۔

کچھ پرانی یادیں

سنگت شبیر جان عرف **لکمیر جان** کے ساتھ

محمد یوسف بلوچ

آج میں اپنے ایک پیارے دوست کے ساتھ اپنی دوستی اور گزرے ہوئے یادوں کے دریچے کھول کر انہیں قلم کی مبارک نوک پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر معلوم نہیں کہ قلم اور میرے کانپتے ہوئے نحیف ہاتھ میرے دل کی یاداشتوں کو کس طرح کاغذ مبارک کی زینت بنا کر میرے اس عظیم دوست کے ساتھ میری نظریاتی وابستگی کی عکس بندی کریگی۔ میرے جلے ہوئے مغمور دل کی گھیرائیوں ں میں وہ الفاظ ہونگے کہ میں اپنے دوست شبیر جان کی شخصیت، فکر، قومی تحریک سے وابستگی بیان کرسکوں۔ نہیں جانتا لیکن اس کے باوجود بھی ایک ادنیٰ کوشش ضرور کرونگا تا کہ شبیر جان کی فکر کے لیے میرے قلم سے سیاہی کے چند قطرے اس سمندر میں داخل ہوں جو نظریہ شبیر ہے۔ شبیر جان سے جو بھی واقف ہے وہ یہ کہنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریگا کہ شبیر کی سوچ بحرِ بلوچ کی مانند گہرا تھا، شبیر میں اتنی برداشت تھی کہ وہ کسی سمندر کی طرح ہر طوفان کا مقابلہ کرسکے، شبیر کی فکر بھی مانند سمندر گہرا تھا جسے ماپنے کے لیے شاید کوئی پیمانہ ایجاد ہی نہیں ہوا۔ شبیر جان سے میری پہلی ملاقات 2011ء میں آواران ترتیج میں ہوا۔ میں بحیثیت بی این ایم کے مرکزی کمیٹی کا ممبر آواران کے دورے پہ تھا۔ پارٹی دوستوں سے ملنے کے ساتھ شبیر جان سے بھی میری ملاقات ہوگئی جہاں اس وقت شہید رضاء جہانگیر، اسیر بلوچ رہنماء عزت جان کو بھی دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس ملاقات کے بعد ہمارا یہ رابطہ اور رشتہ ہر وقت قائم ودائم رہا۔ کیونکہ یہ رشتے خونی رشتوں سے کئی گنا زیادہ مظبوط اور مستحکم تھے ہمارے رشتے نظریاتی وفکری بنیادوں پر استوار تھے ۔ان رشتوں کی قدر سے ہر وہ انسان باعلم ہے جس کا تعلق اسی بنیاد پہ کبھی استوار ہوا ہو۔ جب بھی میں آواران جاتا تو الم (ہر حال میں) ان دوستوں سے ملاقات ہوتا یا یہ دوست کبھی بھی تربت اور مند تنظیمی دورے پر آتے تو مجھ ناچیز سے ضرور ملتے تھے۔ ان دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر دل کو سکون ملتا تھا کیونکہ شہید رضا جان، شبیر جان اور عزت جان ہمیشہ قومی تحریک میں سرگرم عمل تھے۔ بی ایس آواز ادی سیاست سے سرشار ہوکر بلوچ قوم کو شعور آگہی دیتے رہے اور دشمن ریاست کی جارہانہ ہتکھنڈوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی قومی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ جس کی وجہ سے دشمن نے 14 اگست 2013ء کو رضا جان عرف شے مرید جان کو میرے ایک اور دوست، ہم رکاب، ہمسفر ساتھی امداذ بجیر کے ساتھ تربت میں شہید کردیا۔ مگر بی ایس اور اور قومی تحریک کو ریاستی اہلکار زوال نہ دے سکے اور نہ کاروان آزادی کو روک سکے۔ ان دوستوں کی شہادت کے بعد تنظیم کی ساری ذمہ داری شبیر جان اور اس جیسے دوستوں کے حصے میں آیا جہاں انہوں نے دن رات ایک کرکے بلوچ قوم کو جہد آزادی کی اہمیت سے آگہائی دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ابھی اس کارواں کا یہ عظیم ہستی اپنے حصے کی ذمہ داریاں پوری طرح نبھا نہ سکا تھا کہ 4 اکتوبر 2016ء کو گورکوپ سے ریاستی قبضہ گیر فوج اور حفیہ اداروں کے اہلکاروں نے تنظیمی دورے پر آئے ہوئے شبیر جان کو جبری طور پر عوام کے سامنے اغواہ کرکے

اپنے ساتھ لے گئے۔ جب یہ منحوس خبر میں نے سنا تو مجھ پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا کیونکہ اس سے پہلے شہید چیئر میں غلام محمد، شہید لالہ منیر، شہید شیر محمد، شہید لالا حمید، شہید قمبر چاکر، شہید الیاس نذر، شہید آصف جان، شہید رزاق گل، شہید رسول بخش مینگل اور کئی بلوچ فرزندوں کے ریاستی اغواہ کے بعد ان کی مسخ شدہ لاشیں ویرانوں میں پڑے ملیں۔ شبیر جان کی جبری گمشدگی کے بعد یہ مناظر مجھ جیسے کمزور انسان کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے اور دل دہل گیا کہ خدانخواستہ شبیر جان کے ساتھ بھی ایسا کچھ نہ ہو جائے۔ اور ڈاکٹر دین ذاکر جان غفور جان زاہد جان، زرینہ مری سمیت کئی بلوچ فرزندوں، ماں، بہنوں، کم سن بچوں کی ریاستی زندانوں میں ٹارچر سیلوں میں اذیتیں سہے رہے ہیں جہاں آئے روز بلوچوں کو ان تاریک کوٹھڑیوں کی نظر کی جاتی ہے۔ سالوں کی تشدد و ظلم کا شکار ہو کر زندہ بھی ہیں یا شہادت کا عظیم رتبہ پا کر اجتماعی قبرون میں دفن کر دیئے گئے ہیں، چونکہ میں ان اذیت گاہوں کی سیر کر چکا ہوں شاید یہی وجہ ہے کہ مجھ پہ سکتہ طاری ہو گیا جب مجھے شبیر جان کی جبری گمشدگی کی اطلاع ملی۔ پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ شبیر جان جس سے میں کچھ دن قبل ملاقات کر چکا تھا، جہاں اس کی نظریاتی باتیں، باتیں بھی ایسی کہ جب سننا نصیب ہو تو آنکھ، کان، دل و دماغ سب حوالہ شبیر کیا جائے، کہ اے شبیر رس گھول دو اس دل میں تا کہ یہ دل فقط نظریہ کے نام پہ دھڑکتا رہے، نور کا سرمہ لگا دو ۔۔۔ان آنکھوں میں تا کہ یہ آنکھیں ہر وقت نظریاتی دوستوں کی متلاشی ہوں، ٹھونس دو یہ نظریاتی باتیں اس دماغ میں تا کہ سوچ نظریہ بن جائے ۔۔۔سنا دو کچھ نظریاتی اقوال تا کہ یہ کان جب بھی سماعت کے لیے تیار ہوں تو فقط فکر اور نظریہ ہی ان میں جگہ بنا پائے۔ کچھ ایسا تھا ہمارا شبیر، جو خود اپنی مثال آپ تھا۔۔۔ابھی شبیر جان تیرا غم دل کو چیر رہا تھا کہ ریاستی درندوں نے ہمارا ساتھی، دوست، ہمسفر عزت جان کو حسام بلوچ اور ساتھیوں کے ساتھ کراچی سے اغواہ کر کے اذیت خانوں کی نظر کر دیا، وہ اذیت خانے جن کی وحشت سے تو واقف ہے، وہ اذیت خانے جہاں روشنیوں کا سفر بھی ممکن نہیں، وہ اذیت خانے جو ظلم چنگیزی کو بھی مات دیں۔ آج میں عدالت انصاف اور تمام عالمی قوتوں سے سوال کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اقوام متحدہ بین اقوامی تنظیم سے وابسطہ جان سولنکی کی گرفتاری پر تو آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے لیکن جب کوئی محکوم کسی جابر کے ظلم کا شکار ہوتا ہے تو یہ عالمی ادارہ اور اس کے ساتھ خود کو مہذب کہنے والا دنیا اور دیگر عالمی ادارے کیونکر چھپ سادھ لیتے ہیں۔ کیا جان سولنکی گوری چمڑی کا بنا تھا اور بلوچ کی رنگت اس سے نہیں ملتی، کیا جان سولنکی مغرب کا رہائشی تھا اور بلوچ ایک پسماندہ خطے سے تعلق رکھتا ہے، کیا سولنکی کا تعلق آزاد قوم سے تھا اور بلوچ غلامی کی قیمت ادا کر رہی ہے، کیا یہ عالمی ادارے اور یہ مہذب دنیا انسانوں کو خانوں میں تقسیم کر رہی ہے اگر ایسا ہے جو بظاہر لگ بھی رہا ہے تو کوئی گلہ نہیں اگر ادارے انسانیت کے نام پہ وجود میں آئے ہیں اور مغرب خود کو مہذب کہتے نہیں تھکتی تو انہیں کردار ادا کرنا چاہیے نہیں تو تاریخ کے مجرمانہ القابات کے لیے خود کو تیار کریں۔ اس دوران جب جان سولنکی اغواء ہو جاتے ہیں تو یہ ادارے خاص کر اقوام متحدہ وایلہ کر کے آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے اور بلوچ قوم سے رہائی کی اپیل کر کے جان سلونکی کی رہائی کے لیے قوم کو کردار ادا کرنے کا کہتا ہے۔ آج جب میں بلوچ ماں بہنوں کی فریاد سنتا ہوں جہاں کوئی ان کا پرسان حال نہیں، جہاں سماعت سے محروم اس بہری دنیا کو ان کی آواز، ان کی آہیں سنائی نہیں دیتی۔ تو مجھے اس دور کے جان سولنکی کی ماں یاد آتی ہے جب انہوں نے اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے بلوچ قوم سے اپیل کی تھی اور بلوچ قوم نے اپنے مہذب ہونے کا ثبوت دیکر نہ صرف جان سولنکی کو رہا کر دیا بلکہ اس موصوف کو دوران قید کوئی تکلیف تک نہیں دی تھی جس کا اظہار بعد میں جان سولنکی نے خود بھی کیا کہ مجھے

انہوں نے عزت وتکریم بخشی۔ایک. جان سلونکی کی رہائی کے بدلے میں بلوچ قوم شہید غلام محمد بلوچ،شہید سنگت ثناء بلوچ، ذاکر جان جو اقوام متحدہ کی بلوچ امن کمیٹی کی ممبر تھے قربانی دیکر جان سلونکی کی رہائی ممکن بنادی۔شہید غلام محمد بلوچ،شہید لالا منیر بلوچ،شہید شیر محمد بلوچ کے پاکستانی اہلکاروں کے ہاتھوا غواء اور شہادت کے ایک دن بعد 4 اپریل کو رہا کروا کے اقوام متحدہ کی جھولی میں زندہ جان سلو کی رکھدیا مگر غلام محمد بلوچ کی عظیم ماں کی گود میں شہید غلام محمد بلوچ کی مسخ شدہ لاش شہید لالا منر،شہید شیر محمد کے ساتھ تابوتوں میں ڈال کر تحفے میں دیا۔مگر اقوام متحدہ، عالمی قوتیں، بینائی سے محروم عدالتیں اور انصاف کے دفاتر میں تشریف فرما اندھے، بہرے انسانوں کی حرکتوں سے یہ واضح ہوا کہ محکوموں کی شنوائی اس دنیا کے ترقی یافتہ اور مہذب ہونے کے دعویدار نہیں کر سکتے۔حالات جب اس نہج پہ پہنچ چکے ہیں جہاں انسانیت کے نام پہ بننے والے اداروں میں انسان نماء مشینیں انسانیت کی تذلیل پہ اتر آئے ہیں تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں انسانیت کے ان ٹھیکداروں سے کیا بلوچ انسان نہیں ہیں کہ قابض پاکستانی خوانخوار فوجیں ہماری سرزمین پر ہماری نسل کشی میں مصرفِ عمل ہے اور انسانیت کے دعویدار، مہذب دنیا کا راگ الاپنے والے تماشائی بن کر ظالم کی حوصلہ افزائی کر کے تاریخ کے مجرم نہیں بن رہے ہیں؟

شبیر جان تجھ پر اور ساتھیوں پر ہونے والے ظلم میں انسانیت کے چمپیئن برابر کے شراکت دار ہیں۔۔۔

زندگی کی تلاش میں

ذاکر بلوچ

اس مفاد پرست دنیا میں انسان دکھ و تکلیف سے گذر کر ہی انسانیت کی منزل کو پہنچ سکتا ہے۔ بغیر دکھ و تکلیف کے انسانیت کی منزل تک پہنچنے کا خواب دیوانے ہی دیکھا کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر اگر بلوچستان کی صورتحال کا تجزیہ کریں تو ان تمام حالات میں ہمیں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ بلوچستان کے نوجوان حقیقی زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہر دکھ و تکلیف کو خندہ پیشانی سے قبول کر رہے ہیں۔ انہی نوجوانوں میں ایک نوجوان شبیر عرف لکمیر بلوچ ہے جنہوں نے کم عمری میں بی ایس او کے پلیٹ فارم سے پرامن سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا اور اپنے سیاسی جدوجہد کے چند سالوں میں دیگر نوجونوں کی طرح ریاستی عتاب کا شکار ہوگیا۔ لکمیر بلوچ کے لئے میں کیا لکھوں شاید میرے الفاظ اس نوجوان کے کردار کو صحیح پیش نہ کرسکیں کیونکہ لکمیر کا تعلق نوجوانوں کے ان قبیل سے تھا جو قربانی دینے کا فن بخوبی جانتے تھے، وہ ان نوجوانوں میں شامل تھے جو ہمیشہ تخلیق و تحقیق کی جانب راغب رہتے اور ہر وقت کچھ نیا کرنے کی چاہت اس نوجوان کی خاص صلاحیت تھی۔ اس لیئے ایک ایسی زندگی کی تلاش میں اس نے کم عمری میں ہی عہد کیا کہ وہ اپنے قوم کے لئے ایک ایسی زندگی چاہتا ہے جن کو وہاں کوئی دکھ اور تکلیف نہ ہو، کوئی ان سے آقا و غلام جیسا سلوک نہ کرے اور اس راہ میں وہ ہمیشہ ثابت قدم رہا۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اسکے قدم نہیں ڈگمگائے بلکہ مشکلات اور تکالیف نے اسے کم عمری میں ہی ایک مضبوط انسان بنا دیا تھا اور ہر تکلیف کو برداشت کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ایک شعوری نوجوان تھا۔ لکمیر بلوچ ہو یا بی ایس او آزاد کے پلیٹ فارم سے جدوجہد کرنے والے دیگر نوجوان سب علم دوست اور انسان دوستی کے جذبے سے سرشار تھے جنکی زندگی کا مقصد ایک نئی دنیا کا حصول تھا اور وہ تھا آزاد بلوچ ریاست جہاں تمام بلوچ ایک قومی وحدت میں متحد ہوکر خوشحال زندگی اپنی مرضی سے گذار سکیں۔ جب نودان بلوچ، عزت بلوچ اور چراغ بلوچ کو لاپتہ کیا گیا تو لکمیر بلوچ سخت پریشانی میں مبتلا ہوا ہوگا کیونکہ ٹاپ لیڈرشپ کی گرفتاری وقتی طور پر تنظیم کو دو قدم پیچھے کی طرف دھکیل دیتی ہیں اور جب انکی ملاقات ٹارچر سیل میں ہوئی ہوگی تو ضرور لکمیر تنظیم کے بارے میں سوچ کر سخت پریشان ہوا ہوگا لیکن جب اسے بی ایس او آزاد کے کامیاب کونسل سیشن کے انعقاد کا پتہ چلا ہوگا تو وہ خوشی کے مارے پھولے نہ سمایا ہوگا کہ بی ایس او آزاد میں اب بھی ایسے نوجوان موجود ہیں جو شہدا اور اسیر لیڈران کے مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا جذبہ و قابلیت رکھتے ہیں۔ شبیر بلوچ و بی ایس او کے تمام اسیر رہنماء جو ریاست کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بلوچ سماج میں سیاسی شعور پھیلانے میں اہم کردار ادا کر رہے تھے، جن کا وجود خود ریاست کے لئے خطرے کی علامت تھی، ایسے نوجوان ہر مقام پر ریاستوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوتے۔ اس لیئے انہیں ایک رکاوٹ سمجھ کر اپنے راستے سے ہٹایا جاتا ہے اور زندانوں میں بدترین تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد کسی جنگل میں انکی لاشوں کو پھینک دیا جاتا ہے، لیکن یہ استحصالی طاقتیں شاید اس حقیقت سے آشنا نہیں کہ ظلم بڑھنے کے بعد شعور میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور ان نوجوانوں کی قربانی نے بلوچ عوام میں قربانی کا جذبہ بیدار کیا ہے۔ آج بلوچ قومی تحریک سے منسلک نوجوان انہی راہوں کے مسافر ہیں جن پر زاہد جان، ذاکر جان، عزت جان شبیر اور دیگر نوجوانوں نے اپنی تمام زندگی وقف کردی اور آج انکے نقش قدم پر چلنے کے لیے بلوچ عوام کا ہر فرزند تیار ہے۔

پریس کانفرنس اور بیانات

شبیر بلوچ مجرم ہے تو عدالتوں میں پیش کیا جائے۔

سیما بلوچ

بی ایس او آزاد کے لاپتہ رہنما شبیر بلوچ کی گرفتاری کے دو سال مکمل ہونے پر ان کی بہن نے پریس کانفرنس کرتے ہوئے کہا ہے کہ آج ہم جس کرب کا سامنا کررہے ہیں وہ میں بیان نہیں کرسکتی کیونکہ کسی کے گھر سے نوجوانوں کا لاپتہ ہونا زندگی کا ایک کربناک دور ہوتا ہے اور خدا کسی کو یہ دن نہ دکھائے، دو سال گزرنے کے باوجود اس کیس کا ایف آئی آر درج نہیں کیا جارہا ہے۔ لاپتہ بلوچ طالبعلم شبیر بلوچ کی ہمشیرہ نے کراچی پریس کلب میں پریس کانفرنس کرتے ہوئے صحافیوں سے مخاطب ہوکر کہا کہ میں سیما بلوچ لاپتہ شبیر بلوچ کی بہن آج ایک بار پھر آپ کے سامنے اپنے بھائی کا کیس لائی ہوں تاکہ آپ لوگوں کی توسط سے ملک کے اعلیٰ اداروں تک اپنی آواز پہنچا سکوں۔ میرے بھائی شبیر بلوچ کو آج سے دو سال قبل تربت کے علاقے گورکوپ سے فرنٹیئر کور کے اہلکاروں نے ان کی اہلیہ کے سامنے سے اٹھا کر لاپتہ کردیا۔ آج میرے بھائی کی گمشدگی کو دو سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن انکی زندگی کے بارے میں ہمیں کوئی اطلاع نہیں دی گئی ہے کہ وہ کس حال میں ہے، زندہ ہے یا اسے بھی دیگر لاپتہ افراد کی طرح ماروائے عدالت قتل کرکے ویرانوں میں پھینک دیا گیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہم نے شبیر بلوچ کی بحفاظت بازیابی کے لیئے احتجاجی مظاہرے کیئے، ریلیاں نکالیں، کراچی و دیگر مقامات پر پریس کانفرنسز کے ذریعے اپنی آواز متعلقہ اداروں تک پہنچائی، انسانی حقوق کمیشن آف پاکستان کے ذمہ داران سے ملاقاتیں کیں، ایشین ہیومین رائٹس کمیشن کو اس کیس کے بارے میں آگاہی فراہم کی اور بلوچستان ہائی کورٹ میں پٹیشن دائر کی، انصاف کے اعلیٰ اداروں کے روبرو پیش ہوئے۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن کو اس کیس کے حوالے آگاہی فراہم کی لیکن نتیجہ صرف جھوٹی تسلیوں کی صورت میں سامنے آیا۔ ہم نے اپنی بساط کے مطابق ملک کے تمام اداروں کے در کھٹکھٹائے لیکن میرے بھائی کو ابھی تک منظر عام پر لانا کجا اس کے بارے ہمیں اطلاع بھی نہیں دی جارہی ہے۔ سیما بلوچ نے مزید کہا اقوام متحدہ اور خود پاکستان کے اپنے آئین کے مطابق ریاست شہریوں کے تحفظ کا ذمہ دار ہوگا لیکن اس کے برعکس امن وامان قائم رکھنے والے ادارے جو ہمارے تحفظ کے ذمہ دار ہیں۔ انہی کے اہلکار ہمارے بچوں اور بھائیوں کو اٹھا کر لاپتہ کررہے ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی قانون اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی فرد کو حبس بے جا میں رکھا جائے لیکن بلوچ لاپتہ افراد آٹھ آٹھ سالوں سے عدالتوں کے سامنے پیش نہیں کیئے جاتے ہیں۔ انہوں نے صحافیوں سے مخاطب ہوکر مزید کہا اگر ہمارا بھائی گناہ گار ہے، اس نے کوئی جرم کیا ہے تو اسے عدالتوں میں پیش کیا جائے، قانون کے مطابق سزا دی جائے یوں حبس بے جا میں رکھ کر پورے خاندان کو کرب میں مبتلا نہ کیا جائے۔ آج ہم جس کرب کا سامنا کررہے ہیں وہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ کیونکہ کسی کے گھر سے نوجوانوں کا لاپتہ ہونا زندگی کا ایک کربناک دور ہوتا ہے اور خدا کسی کو یہ دن نہ دکھائے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ظلم کی انتہاء تو یہ ہے کہ آج ہمارے بھائی کو لاپتہ ہوئے دو سال کا عرصہ بیت چکا ہے لیکن اس کی گمشدگی کی ایف آئی آر درج نہیں کی جاتی۔ جب ہم ایف آئی آر درج کرانے تربت پولیس اسٹیشن

گئے تو پولیس ہمارا ایف آئی آر تک درج کرانے کو تیار نہیں ہوئے۔ اتنی ناانصافیوں کے باوجود ہم اپنے بھائی کی بازیابی کی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں اور آج ہم آپ لوگوں کی توسط سے اپنے دکھ و درد کی داستان اعلیٰ عہدے داروں اور انسانی حقوق کے علمبرداروں تک پہنچانا چاہتے ہیں تاکہ ہمارا بھائی اور دیگر لاپتہ افراد بازیاب ہوکر صحیح سلامت اپنے گھروں کو لوٹ سکیں۔ انہوں نے صحافیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں امید کرتی ہو کہ آپ حق و سچ کا ساتھ دیکر صحافتی اقداروں کو بحال کرنے کی جدوجہد کریں گے اور غیر جانبدارانہ رویہ اپنا کر لاپتہ افراد کے اہلخانہ کے تکالیف و مصائب کی تشہیر پیشہ وارانہ بنیاد پر کریں گے۔ ہم آپ کے توسط سے سول سوسائٹی، انسانی حقوق کے اداروں سے تعاون کی اپیل کرتے ہیں کہ وہ لاپتہ افراد کی بازیابی میں ان کے خاندانوں کا ساتھ دیں اور چیف جسٹس آف پاکستان سے اپیل کرتے ہیں کہ میرے بھائی سمیت تمام لاپتہ افراد کی بحفاظت بازیابی کے لیے عملی بنیادوں پر اقدامات کریں تاکہ ان کے اہلخانہ سکون سے اپنی زندگی گزاریں۔

سماجی رشتوں کو نبھانے کے علاوہ بلوچ خواتین انقلابی عمل کا حصہ بن چکی ہیں۔

ماما قدیر بلوچ

لاپتہ بلوچ اسیران، شہدا کے بھوک ہڑتالی کیمپ کو 3381 دن ہوگئے۔ بی ایچ آر او کے چیئرپرسن بی بی گل وائس چیئرپرسن طیبہ بلوچ اور حوران بلوچ نے شرکت کر کے اظہار یکجہتی کی۔ کل سے بی ایس او آزاد کے انفارمیشن سیکریٹری شبیر بلوچ کی اہلیہ اور ہمشیرہ سیما بھی اپنے بھائی کے بازیابی کے لئے بیٹھی ہیں اور سیما بلوچ نے کہا میری نوجوان بھائی کی گمشدگی نے پورے خاندان کو ناقابل بیان اذیت سے دوچار کیا ہے ہمارے درد سے وہی لوگ آشنا ہیں جو اس مرحلے سے گزر رہی ہیں، پاکستان میں انسانیت نام کی کوئی شئے ہوتی تو آج لاکھوں لوگ ہمارے شانہ بشانہ ہوتے۔ سیما بلوچ نے سوال اٹھایا کہ ایسے سماج انسانی سماج کہلانے کے حقدار ہیں جہاں انسانیت کی کوئی قدر نہ ہو، کیا ہم انسان نہیں ہیں، آج متعدد لوگ اس بات کی گواہی دیں گے کہ میرے بھائی کو ہمارے نظروں کے سامنے فورسز نے آپریشن کے دوران اٹھالیا لیکن پاکستانی عدلیہ، سول سوسائٹی، سیاستدانوں کلمہ حق کہنے سے کتراتے ہیں ان رویوں نے آج انسانیت کو شرمسار کر دیا ہے۔ وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے وائس چیئرمین ماما قدیر بلوچ نے کہا کہ دنیا کی تاریخ پر ہم اگر نظر ڈالیں تو ہر دور میں عورت نے معاشرے میں ایک مثالی کردار ادا کیا ہے، ماں کی شکل میں، بہن کی شکل سمیت مختلف رشتوں کی شکل میں اہم کردار نبھانے کے باوجود عورت انسانی حقوق کی پامالیوں کے خلاف بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، آج بلوچ عورت نے اپنے اندر غلامی سوچ کی نفی کرتے ہوئے اپنے اندر ایک انقلابی سوچ پیدا کر چکی ہے۔ بلوچ عورت انسانی سوچ، انسانیت سے پیار کا احساس، قوم کی محکومی اپنے قوم کے ساتھ ہونے والے ظلم کو محسوس کرتے ہوئے اپنے شعور میں اضافہ کرنے کی تگ و دو اور جدوجہد میں ہے۔ ماما قدیر بلوچ نے مزید کہا کہ ریاستی مظالم انسانی حقوق کی بدترین پامالی سے لیکر گمشدگیوں و مسخ شدہ لاشوں کی شکل میں بلوچ نسل کشی تک ایسی کونسی حد رہ گئی ہے جس تک پہنچا نہ گیا ہو یا اسے پار نہ کیا گیا ہو، پاکستانی فورسز، ایف سی، خفیہ اداروں اور انکی ڈیتھ اسکواڈ کے ہاتھوں شہدا اور جبری طور پر لاپتہ بلوچ فرزندوں سے سیاسی جماعتوں وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز و انسانی کے حقوق سرگرم تنظیموں اور عالمی رائے عامہ کو بلوچ قومی حمایت حاصل ہے بلوچستان میں اس وقت پاکستانی جبری علمداری دو ستون پر کھڑی ہے ایک ستون قومی تحریک و انسانی شرف کی شعور و قومی غیرت سے محروم، اقتدار کے لالچی علمداری والے افراد نام نہاد سیاسی جماعتیں کٹھ پتلی اسمبلی اور کابینہ اور دوسرا ستون چور ڈاکو قاتل منشیات پروش سماج و دشمن عناصر اور قومی غداروں پر مشتمل ہے۔

انسانی حقوق کے ادارے بھائی کے بازیابی میں کردار ادا کریں۔

سیما بلوچ

بلوچستان میں ریاست کی خونی آپریشن اپنی تمام تر سفاکیت اور ہولناکیوں کے ساتھ جاری وساری ہے، ماما قدیر بلوچ کی اظہار یکجہتی کرنے والوں سے بات چیت، لاپتہ افراد وشہدا کے بھوک ہڑتالی کیمپ کو 3380 دن ہو گے۔تفصیلات کے مطابق آج بھوک ہڑتالی کیمپ میں بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے لاپتہ انفارمیشن سیکریٹری شبیر بلوچ کی اہلیہ اور بہن سیما بلوچ بھی شریک تھے، سیما بلوچ نے کوئٹہ پریس کلب میں کل ہی اعلان کیا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی عدم بازیابی کے خلاف وائس فار بلوچ مسنگ پرسن کے کیمپ میں ایک ہفتے کی علامتی بھوک ہڑتال پر بیٹھیں گی، آج کیمپ میں ان کی پہلی دن تھی۔ سیما بلوچ نے کہا کہ میرے بھائی کو 4 اکتوبر 2016 کو گورکوپ سے پاکستانی فوج نے اغوا کیا تا حال ان کے بارے میں ہمیں کوئی خبر نہیں کہ وہ کس حال میں ہیں۔انہوں نے کہا کہ وہ ایک ہفتے تک کیمپ میں احتجاج پر بیٹھے رہیں گے اور انسانی حقوق کے اداروں اور انسان دوست لوگوں سے اپیل کرتی ہوں کہ وہ میرے بھائی کی بازیابی میں کردار ادا کریں۔آج بلوچ ہیومن رائٹس آرگنائزیشن کے چیئرپرسن بی بی گل بلوچ اور وائس چیئرپرسن طیبہ بلوچ نے لاپتہ افراد وشہدا کے لواحقین سے اظہار یکجہتی کی وائس فار بلوچ مسنگ پرسن کے وائس چیرمین ماما قدیر بلوچ نے گفتگو کرتے ہوے کہا کہ بلوچستان میں ریاست کی خونی آپریشن اپنی تمام تر سفاکیت اور ہولناکیوں کے ساتھ جاری وساری ہے۔ بلوچستان کا کوئی نہ کوئی جگہ دیہات نہیں بچا جہاں دشمن فورسز نے اپنی بربریت کی صورت فوج کشی نہ کی گئی ہو۔ پینتالیس ہزار سے زائد بلوچوں کو جن میں خواتین اور بچے بھی شامل ہیں مسنگ پرسنز کی ٹائٹل اوڑھے ریاست کی عقوبت خانوں میں غیر انسانی غیر اخلاقی اور غیر قانونی اذیت کا شکار ہیں۔ جبکہ دس ہزار سے زائد لاپتہ افراد کو مذکورہ ٹارچر سیلوں میں اذیت ناک تشدد کے بعد شہید کر کے انکی مسخ شدہ لاشیں بلوچستان بھر میں پھینک دی جاتی ہے۔ ماما قدیر بلوچ نے مزید وفد سے کہا کہ لاکھوں کے تعداد میں بلوچ عوام بلوچستان سے ہجرت کر کے دوسرے صوبوں میں خاک چھاننے پر مجبور ہیں۔سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کی گئی ہے۔سیاسی کارکن، دانشور، ادیب، شاعر، طلبا اساتذہ، ڈاکٹر چرواہا، ماہی گیر ،مزدور سمیت ہر طبقہ فکر کو ریاست کی بربریت کا سامنا ہے۔انہوں نے کہا بلوچ قوم کے لے عرصہ حیات مکمل تنگ کر دیا گیا ہے، بلوچستان میں ایک مکمل جنگ کی صورتحال ہے۔ ریاستی فورسز کا چادر و چار دیواری کی تقدس کی پامالی روز کا معمول بنا گیا ہے۔ پنجگور کے علاقے میں خواتین کی عصمت دری کے بعد ان کو اتنا خوفزدہ کیا گیا ہے کہ اگر آپ لوگوں نے زبان کھولی تو دوبارہ آپ لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک ہوگا جو پہلے ہوا تھا اس وجہ سے انہوں نے خاموشی اختیار کی ہوئی ہے گزشتہ دنوں فورسز نے اپنا ننگا ناچ جاری رکھا۔ ماما قدیر بلوچ نے کہا کہ بلوچ کش مافیاز اور فورسز کے لے پالک ڈیتھ اسکواڈ کے اہلکار اور انکے ساتھیوں کی وجہ بلوچستان میں کہیں بھی چادر و چار دیواری محفوظ نہیں اور یہ اغوا اور شہدا میں کوئی کمی نہیں آ ہی ہے بلوچستان مین خونی آپریشن پر ریاستی میڈیا کی خاموشی اور دنیا کو اصل حقائق سے بے خبر رکھنا صحافت کی ہولناک شکل ہے جو بنگلہ دیش آزادی تحریک کے دوران مظالم کی طرح بلوچستان کی خونی تاریخ میں ایک سیاہ کے طور پر ہمیشہ موجود رہے گا۔

انسان کو آزادی اور زندگی کے حق سے محروم رکھنا انسانی حقوق کی بدترین مثال ہے۔

سیما بلوچ

لاپتہ طلبار ہنما شبیر بلوچ کی ہمشیرہ سیما بلوچ نے آج کوئٹہ پریس کلب میں وائس فار بلوچ مسنگ پرسن کے وائس چیئرمین ماما قدیر بلوچ کے ہمراہ ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میرے بھائی شبیر بلوچ کو اغوا ہوئے دو سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے اور ان دو سالوں میں ہمارے خاندان پر کیا گزری اس کا حال ایک دردمند انسان ہی سمجھ سکتا ہے۔ جب سے میرے بھائی شبیر بلوچ کو تربت کے علاقے گورکوپ سے سیکورٹی فورسز کے اہلکاروں نے دوران آپریشن جبری طور پر لاپتہ کر دیا۔ اس دن سے لیکر آج تک میری زندگی کے بیشتر دن پریس کلبوں میں، عدالتوں میں یا انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والے تنظیموں کے دفتروں میں اپنے بھائی کی عدم بازیابی کے لئے جدوجہد میں گزرے لیکن بدقسمتی سے کہنا پڑ رہی ہے کہ میرے بھائی کا آج بھی کچھ پتہ نہیں۔ ان دو سالوں میں سوائے تسلیوں کے ہمیں کچھ نہیں ملا۔ سیما بلوچ نے کہا اپنے بھائی کی بازیابی کے لئے کبھی کراچی پریس کلب کے سامنے تو کبھی کوئٹہ پریس کلب کے سامنے اعلی حکام کو اپنے بھائی کی جبری گمشدگی کی روداد سنائی، ایف آئی آر کیلئے متعلقہ پولیس اسٹیشن سے کئی بار التجا کئے مگر ایف آئی آر کاٹنے میں انکار رہے، کورٹ میں پیٹیشن دائر کی لیکن وہاں سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہ لگا۔ اپنے بھائی کی عدم بازیابی کے لئے احتجاجی مظاہرے کئے۔ ریلیاں نکالی لیکن میرا بھائی آج بھی بازیاب نہ ہوسکا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ہیومین رائٹس کمیشن آف پاکستان، ایشین ہیومین رائٹس کمیشن و ایمنسٹی انٹرنیشنل کے سامنے بھی اپنے بھائی کا کیس پیش کیا۔ ان اداروں نے میرے بھائی کی فوری بازیابی کا مطالبہ حکومت پاکستان کے سامنے کیا لیکن آج دو سالوں کے بعد بھی میرا بھائی بازیاب نہ ہوسکا۔ شبیر بلوچ ایک طالب علم تھا جسے 4 اکتوبر 2016 کو سیکورٹی فورسز نے جبری طور پر لاپتہ کر دیا لیکن ہمیں آج تک یہ معلوم نہیں کہ کس جرم کی پاداش میں ہمارے بھائی کو یوں اٹھا کر لاپتہ کیا گیا۔ انسانی حقوق کے عالمی قوانین کے مطابق اگر کسی شخص سے کوئی جرم سرزد ہوجاتا ہے تو اسے عدالتوں کے روبرو پیش کیا جاتا ہے لیکن بلوچستان میں صورتحال مختلف ہے۔ یہاں سے لوگوں کو جبری طور پر گمشدہ کیا جاتا ہے اور کئی کئی دنوں تک تشدد کرنے کے بعد انکو ماورائے عدالت قتل کیا جاتا ہے جو انسان کو زندہ رہنے و آزادی سے اپنی زندگی گزارنے سے محروم رکھنا ہے جو انسانی حقوق کی بدترین مثال ہے۔ سیما بلوچ نے کہا ہم گزشتہ دو سالوں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ اگر میرا بھائی کسی جرم میں ملوث ہے تو اسے عدالتوں کے روبرو پیش کیا جائے اور جرم ثابت ہونے پر قانونی اصولوں کے مطابق سزا کے عمل سے گزارا جائے ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن یوں جبس بے جاء ▯ میں رکھ کر اہلخانہ کو اذیت میں مبتلا کرنا انسانیت کی توہین کے مترادف ہوگا۔ بلوچستان کے اکثریتی خاندان اس اذیت ناک مراحل سے گزر رہے ہیں۔ ایک نوجوان بھائی کے لاپتہ ہونے کا مطلب گھر کے دیگر افراد کو شدید ذہنی اذیت میں مبتلا رکھنا ہے۔ آخر میں انہوں صحافیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہ سیما بلوچ شبیر بلوچ کی بہن ایک مرتبہ پھر اپنے بھائی کی بازیابی کا مطالبہ لئے آپ کے سامنے حاضر ہوئی ہوتا کہ آپ نہ صرف میرے بھائی کی بازیابی کے لئے آواز بلند کریں بلکہ بلوچستان میں انسانوں کی پراسرار گمشدگی کو اجاگر کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ انہوں نے کہا کہ آج سے میں اپنے بھائی کی عدم بازیابی کے لئے وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے کیمپ میں ایک ہفتے کی علامتی بھوک ہڑتال میں بیٹھنے کا اعلان اس امید میں کرتی ہو کہ آپ میری آواز بن کر اپنے ذمہ داریوں کو بھرپور انداز میں پورا کرنے کی کوشش کرینگے۔

بی این ایم لٹریری فورم، پارٹی ءِ چیر دستی ءَ کارکنوکیں ادارہ ہے۔ اشی ءِ کار ہمیش اِنت کہ بلوچ راجی ءُ سیاسی جیڑ ہانی سرانبشتانک، پٹّ ءُ پولاں یکجا گہ بکنت ءُ دیما بیاریت۔ اے فورم ءَ تاں اے وہدا بلوچ راجی جُنز ءِ تاریخ ءِ سرابازیں نبشتہ ءِ پَٹّ ءِ پول دیما آورتگ اَنت کہ پارٹی ءِ تاک ''زرُمبش'' ءِ دگہ جاگہاں شِنگ بوتگ اَنت۔ اے کتاب ہم ہمے جُہدانی بَہرے۔ گوں وانوکاں مئے دَزبندی اِنت کہ اگاں اے کتاب ءَ رَدی یے گِندَنت تہ اَلّم مارا ہال بدئینت دانکہ کتاب ءِ دیمتری چاپ ءِ تہا اے رَدی گِرگ بوت بکنت۔

شنگگار: زرمبش پبلی کیشن

Zrumbesh Publication

www.zrumbesh.com/publication